دلّی کی شام

دلّی کی شام

احمد علی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

دلّی کی شام

احمد علی

ترجمہ
بلقیس جہاں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی

حصّہ دوم

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

—— میر درد

۱

۱۹۱۱ء کی گرمیاں اس غضب کی تھیں کہ ہر ذی روح گرمی گرمی پکار اٹھا جمال بیگم کی پیٹھ گرمی دانوں سے لدی پڑی تھی۔ ان میں چرمراہٹ جُوں جُوں زیادہ ہوتی وں وں وہ گرمی کی دہائی دیتیں "اوئی بُوا اتنی عمر ہونے کو آئی ایسی نگوڑی گرمی نہ دیکھی نہ سُنی۔ مُوئے دوزخ کے داروغہ نے جہنّم کا منہ ادھر ہی کو کھول دیا۔ خدا کی مارانِ فرشتوں پر" اور وہ انجم زمانی کی خوشامد کرتیں:

"اے انجم تم جیتی رہو ذرا گلاب سفیدہ تو میری پیٹھ پر مل دو۔"

بیگم نہال کبھی کبھی جٹھانی کی باتوں پر صاد کرتے ہوئے کہتیں: "ہاں بی سچ کہتی ہو۔ اب کے تو دِلّی جہنّم بن گئی۔ مجھے تو یاد نہیں غدر کے بعد پھر کبھی ایسی بلا کی گرمی پڑی ہو" اور جمال بیگم ماضی کو یاد کرتیں: "خدا بخشے دادی اماں سے چھُٹ پنے میں سنا کرتے تھے کہ دلّی میں ایک دفعہ ایسی زوروں کی گرمی پڑی تھی کہ جمنا کا پانی کھولنے لگا تھا۔ من من بھر کے مہاشیر پانی سے اچھل اچھل کر ریت پر تڑپتے تھے۔" دلچین باورچی خانہ میں پسینے میں شرابور روٹی توے پر ڈالتی اور بڑبڑاتی

جاتی: "کالا منہ گرمی نے تو بھون دیا، کرموں کا پھل ہے۔"

دن چڑھتے ہی لو چلنی شروع ہو جاتی اور سونی گلیوں میں صبح سے شام تک ماتم کرتی پھرتی اور سارے شہر میں دھول اڑا کرتی۔ کھجور کے تنے پر مٹی کی تہہ چڑھ گئی اور پتے بد رنگ ہو گئے۔ مہندی کا درخت خشک نظر آتا۔ اس کی پتیاں مرجھا مرجھا کر پیلی پڑ گئی تھیں۔

دالانوں پر روئی کے پردے چھوڑ دیے جاتے۔ دروازوں پر خس کی ٹٹیاں لگ جاتیں۔ عورتیں فرشی پنکھوں کے نیچے بچوں کو لے کر پڑ جاتیں۔ چماری اونگھ اونگھ کر پنکھے کی ڈوری کھینچتی اور قلابوں کی یکساں چرچوں گرمی کا شکوہ کرتی ہوئی سنائی دیتی۔ مرد کام اور ضرورت سے باہر نکلتے وقت سر اور کانوں کو رومالوں سے اچھی طرح لپیٹ لیتے۔ چرند اور پرند بدحواس ہو رہے تھے۔ تانگوں کے گھوڑے بھاگتے بھاگتے تڑ سے گر کر ٹھنڈے ہو جاتے۔ کبوتر ذرا کی ذرا اڑتے اور پیاس کی شدت سے چونچیں کھول کر لکھلانے لگتے۔ کوّوں کی کائیں کائیں کانوں میں چبھتی۔ ایسی چلچلاتی دھوپ ہوتی کہ چیلیں بھی انڈا چھوڑ دیتیں اور چلچلاتی پھرا کرتیں۔ ان کی دل خراش چلچلاہٹ گرمی میں اور بھی وحشت ساماں ہوتی۔

آسمان آب و تاب مٹا کر بے رنگ ہو گیا تھا۔ رات کو ستارے گرد و غبار کے پیچھے سے ٹم ٹم کرتے۔ بچھونوں پر مستقل ریت برستی رہتی اور منہ میں آ کر دانتوں میں کرکر ہوتی۔ دن کو آتشِ آفتاب کباب کرتی اور رات کو در و دیوار سے گرم بھپکے نکلتے اور نیم سوختہ جانداروں کے پاس نیند کبھی نہ پھٹکتی تھی۔

چاروں طرف سے برابر چیخنے چلّانے کی آوازیں آتیں۔ گرمی کے ساتھ انسانوں کے مزاجوں میں بھی گرمی آ گئی تھی۔ حواس باختہ ہو کر وہ ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے۔ مائیں بچوں کو ذرا ذرا سی بات پر دُھن کر رکھ دیتیں اور مرد کولا کولا کر
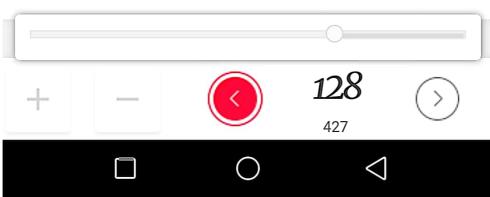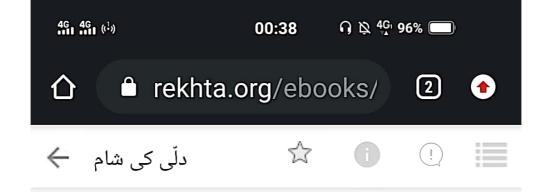
بیویوں سے جھری کتازی ہوتے ـــــ یہی تکا فضیحتی اور شور و شر چوبیس گھنٹے جاری رہتا۔ آدمی کو کہیں امن تھا نہ سکون و قرار۔ آئے دن جدھر سے سنو آگ لگ جانے کی خبریں آتیں۔ تیز لو کے جھکڑ آگ کو اور ہوا دیتے اور شعلوں سے آسمان لال انگارا ہو جاتا۔ کوئی نہ کوئی آدمی روز لو لگ کر دم توڑ دیتا۔ کبوتروں کا بیٹھے بیٹھے منکا ڈھلک جاتا۔ مگر آدمی و حیوان کو گرمی سے کہیں پناہ نہ ملتی۔

ادھر تو گرمی نے یہ قیامت توڑ کر مخلوق کا بھرتا بنا دیا تھا، اُدھر شہر کے باہر موری دروازے سے لے کر پرانے قلعہ سے پرے تک فرنگی بادشاہ کے جشن تاج پوشی کے اہتمام ہو رہے تھے اور کڑی دھوپ میں مزدور اپنا خون پسینہ ایک کر کے میدانوں کو سنوار رہے تھے۔ صبح سے شام تک کہیں مٹی کھود کر گڑھے بھرے جاتے اور کہیں سے اونچے ٹیلے کاٹ کر زمین کو ہموار کیا جاتا اور مئی کا جاں سوز آفتاب ان کے ننگے بدن اور کھلے سروں پر سے ڈھلتا ہوا لب بام آ جاتا، حالانکہ ابھی بادشاہ سلامت کی آمد میں عرصہ تھا اور لوگ اس طرف متوجہ بھی نہ ہوئے تھے۔ چاندنی چوک سے فوّارے اور فوّارے سے لے کر فتحپوری تک بگولے چکر کھاتے ہوئے آسمان کی طرف جاتے اور لو کے تیز و تند گرم جھونکے سڑک کے دو رویہ پیپل کے درختوں سے بے روک ٹوک ٹکراتے اور پتوں سے الجھتے پھرتے۔ لوگ دوکانوں اور مکانوں کو بند کر کے پڑ جاتے۔ گلیاں خالی ہو جاتیں، اور کوچہ و بازار مردہ نظر آتے۔ دن بھر فقط ٹریم کی گھڑ گھڑاہٹ سنائی دیتی، جس میں چند لوگ ہی بیٹھے نظر آتے۔

جب سورج بالکل مغرب میں چلا جاتا تو لوگ اپنے گھروں اور ٹھنڈے تہہ خانوں سے باہر نکل آتے، سڑکوں پر چھڑکاؤ کیتے اور شہر میں زندگی کا وہی شور و غوغا بلند ہو جاتا۔"

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

بھری دوپہر میں میر نہال نور الٰہی بیل والے کی دوکان سے نکلے۔ لو کا ایک جھونکا آیا اور منہ کو جھلستا ہوا نکل گیا اور انھوں نے جلدی سے اپنی گدّی اور کانوں کو ایک چار باغ کے رومال سے ڈھک لیا مگر چکن کے دودھ کھلے انگرکھے میں سے ان کا چوڑا چکلا سینہ دکھائی دے رہا تھا۔ جوں ہی انھوں نے گلی میں قدم رکھا "آؤ بیٹا آؤ بیٹا" کی آواز کسی کوٹھے پر سے آئی۔ بے ارادہ ان کی نظر آسمان پر گئی۔ گرمی سخت تھی مگر آسمان کبوتروں سے پٹا پڑا تھا۔ کبوتروں کو دیکھتے ہی انھیں ایک دم خیال آیا کہ آج صبح جلدی میں اپنے کبوتروں کے جال میں پانی رکھنا قطعی بھول گئے تھے، اور وہ جلدی جلدی قدم اُٹھانے لگے حالانکہ وہ نور الٰہی کے ہاں سے اس خیال سے اٹھے تھے کہ ذرا جا کر بتن جان کی مزاج پُرسی کر آئیں۔ وہ کئی دن سے بیمار تھی۔ لیکن کبوتروں کے خیال سے وہ بے چین ہو رہے تھے اور گھنٹہ گھر سے ہوتے ہوئے راستہ مختصر کرنے کو اس وقت سیدھے بلّی ماران کو مڑ گئے۔ یہی ان کے گھر کا قریب ترین راستہ تھا۔
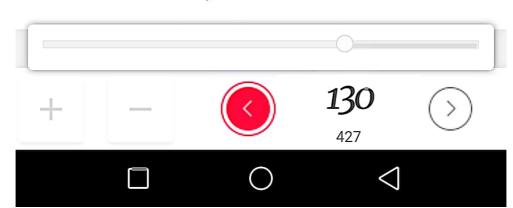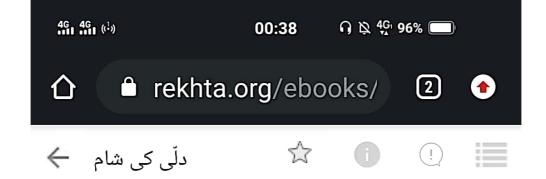
کمپنی باغ سے بہت سی اونٹ گاڑیوں کی لین ڈوری جوں کی چال چلتی ہوئی چرّخ چوں کرتی کھاری باؤلی کی طرف جا رہی تھی اور پوری سڑک ان سے رُک گئی تھی۔ میر نہال کو بہت پیاس لگ رہی تھی اور انھوں نے بلّی ماروں کے نکّڑ پر کھڑے کھڑے سبیل سے پانی پیا۔ بازار میں آمد و رفت شروع ہو چکی تھی اور دوکاندار اپنی اپنی دوکانوں کے سامنے پانی چھڑک رہے تھے۔ جب وہ عطّاروں والی گلی میں پہنچے تو جڑی بوٹیوں اور دواؤں کی تیز بو سے دماغ پھٹنے لگا۔ ہوا کافور میں بسی ہوئی تھی اور جیسے ہی کافور کا بھبکا میر نہال کی ناک میں چڑھا ان کے جسم میں ٹھنڈی پھریری آ گئی اور ریڑھ کی ہڈی تک تھرتھری محسوس ہوئی۔ ان کو اچانک موت کا خیال آیا اور اس کے ساتھ ہی بتن جان کی میٹھی اور غم انگیز یاد بالکل اس طرح آئی جیسے

کسی مرے ہوئے عزیز یا کسی بھولے بسرے پیارے کی یاد کہیں سے آ کر لاشعور کے پردے چاک کر کے دل میں چٹکیاں بھرے، اور آدمی لطفِ غم سے شاد بھی ہو اور ناشاد بھی۔ اور معلوم نہیں کیوں موت اور ربّن جان کے خیال نے ان کو یہ احساس دلایا کہ آفتابِ زیست لبِ بام آتا جا رہا ہے، اور وہ دل ہی دل میں اپنی عمر کا حساب لگانے لگے، اور ان کے حساب کے مطابق وہ پورے باسٹھ برس کے ہو چکے تھے۔ بڑھاپے کا خیال آدمی کو ہمیشہ سوہانِ روح ہوتا ہے۔ اس کمزوری سے میر نہال کو اپنی حالت پر ترس آنے لگا۔ انھوں نے بہتیرا اس خیال کو ٹالنا چاہا لیکن اس وقت ان کی کیفیت عجیب تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ منوں بوجھ تلے دبے جا رہے ہیں۔ ان کا دم گھٹ رہا تھا اور خون تیزی سے گردش کرتا ہوا دماغ کی طرف دوڑ رہا تھا۔ اُن کی آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچ کر اندھیرا آ گیا۔ خون کے دباؤ سے شریانیں اور سر بالکل پھٹتا معلوم ہوا۔ گھبرا کر تھوڑی دیر کو وہ ٹھہر گئے، اور جب اس کیفیت میں کمی ہوئی تو انھوں نے سوچا کہ اس سے پہلے تو ایسا کبھی نہ ہوا تھا، آخر طبیعت خراب ہونے کی کیا وجہ ہے؟ لُو تو نہیں لگ گئی؟ پھر انھیں خود ہی خیال آیا کہ ان کو کچھ دنوں سے قبض کی شکایت تھی اور یہ سبب زیادہ صحیح تھا۔ لہٰذا وہ مطمئن ہو گئے۔

جب وہ کوچہ پنڈت میں پہنچے تو کاچھن ہری ہری کیریاں اور پھل چھلیے میں لیے بیٹھی تھی۔ اس نے میر نہال کو دیکھتے ہی سلام کیا اور حسبِ معمول باتیں ملکانے لگی:

"سرکار بہت گرمی پڑ رہی ہے۔ یہ خربوزے لیتے جائیے، بہت میٹھے ہیں، میرا آدمی آج ہی لکھنؤ سے لے کر آیا ہے۔ یہ کالے کالے شہتوت ہی لے لیجیے۔"

اس کی زبان ہمیشہ تیز قینچی کی طرح لتر لتر چلے جاتی تھی اور آواز بالکل پھٹا ڈھ ا اور چیچک کے داغوں نے چہرے کو بگاڑ دیا تھا۔ لیکن وہ جوان تھی
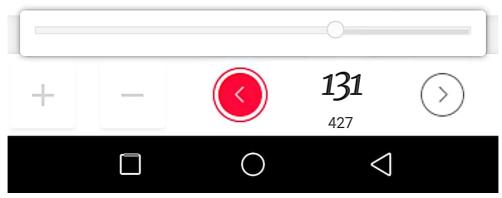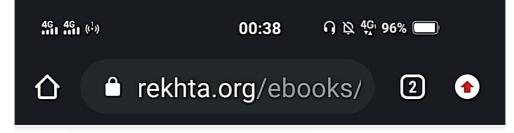
اس کی رانیں خوب گد۔ ابلی ہوئی تھیں، اور دودھ اتنے بڑے تھے کہ سارے ہندوستان کو پلا سکتی تھی۔ میر نہال کو اس وقت اپنے کبوتروں کو پانی پلانے کی جلدی تھی اور وہ صرف دو پیسے کی کیریاں پینے کے واسطے لے کر لوگوں سے علیک سلیک کرتے ہوئے جنگلی کنویں تک آ گئے۔

رستے میں نثار احمد مسجد کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دیے۔ یہ محلّے کی مسجد میں اذان دیا کرتے تھے۔ ان کی عمر کوئی پچاس برس کی تھی۔ ٹخنوں تک اونچا شرعی پاجامہ، کھدر کا گھٹنوں تک کا کرتہ پہنے ہوئے اور سر پر جالی دار خاکستری گول ٹوپی اوڑھے رہتے جس کی باڑھ میلی چیکٹ ہو کر اپنی عمر ختم ہو جانے کی پوری شہادت دیتی تھی اور ایک رومال سیدھے کندھے پر پڑا رہتا تھا۔ ان کا گھٹا ہوا سر کسیرو کی طرح معلوم ہوتا تھا جس پر ان کا ماتھا اور زیادہ واضح اور چوڑا نظر آتا۔ چھجی سی ڈاڑھی مہندی سے مستقل رنگے رہنے کی وجہ سے گہری سرخ ہو گئی تھی۔ صوم و صلوٰۃ اور شرع کے بہت پابند تھے۔ اوپر کے لب پر مونچھیں منڈی ہوئی تھیں اور اس کا گہرا کا ہی رنگ الگ نظر آتا تھا جس کے عین اوپر ان کی کلہاڑا سی ناک بالکل چٹان کی طرح سارے چہرے سے باہر نکلی ہوئی دکھائی دیتی۔ سجدے کرتے کرتے سیاہ گٹا پیشانی پر پڑ گیا تھا جو دور سے ان کی کالی رنگت میں چمکتا تھا۔ نثار احمد گھی بیچ کر روزی کماتے تھے۔ لیکن لوگوں کا کہنا تھا کہ ان کا گھی خالص نہیں ہوتا۔ مگر ان کی اذان کی کشش ایسی تھی کہ ہر زبان ان کو دعائیں دیتی اور لوگ اکثر ان کو جنتی کہتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ مغرب کے وقت ان کی اذان ایمان والوں کے دلوں کو خوف اور محبتِ خدا سے لبریز کر دیتی تھی۔ شام کی گھٹتی ہوئی روشنی میں ان کی آواز آہستہ آہستہ بلند ہوتی اور شوکت و نصرت کا مژدہ دیتی ہوئی ستاروں تک پہنچ جاتی۔ ان کی آواز کا کھٹکا اگر صبح کی تجلی یاد دلاتا تھا تو تراوٗ میں اس بات کا احساس ہوتا تھا
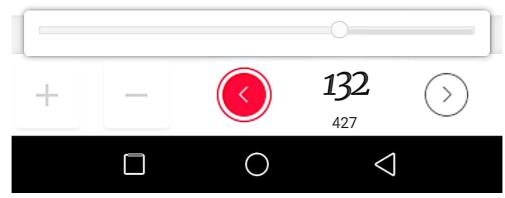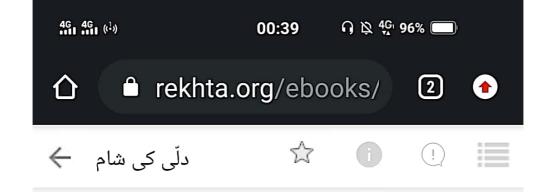
کہ زندگی مجازی ہے، اور کائنات غیر معتبر۔ دُنیائے ناپائیدار کی عبرت دلاتی ہوئی اذان شہر کے شور و شغب کو عبور کرتی ہوئی دور دور سُنائی دیتی پھر آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی اور سکون اور سنّاٹا تھکے ماندے دلوں کو لوریاں دینے لگتا۔

اس وقت میر نہال ان سے اتنا کہنا چاہتے تھے کہ کبوتروں کے لیے گھی بھجوا دیں کیونکہ گھر میں سے گھی لیتے ہوئے اس لیے ڈرتے تھے کہ بیوی فضیحتے کریں گی، مگر نثار احمد میر نہال سے بہت آگے تھے اور محلہ نیاریاں کے موڑ پر آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ یہیں شیخ محمد صادق زردوز کی دوکان تھی۔ جب ان کی نگاہ میر نہال پر پڑی وہ اپنی دوکان سے نیچے اُتر آئے اور میر نہال کی طرف بڑھے۔ اُن کی سیدھی ٹانگ پر چمڑے کا گیٹس بندھا ہوا تھا جس پر چک پھیریاں دے کر وہ ٹُلا بٹا کرتے تھے۔ ان کی تل چانولی چگی ڈاڑھی پر مہندی سے رنگے ہوئے سر کے بال عجب مضحکہ خیز معلوم ہوتے تھے۔ ان کا لال ازار بند لٹک رہا تھا اور ریڑیں زمین کو چھو کر ادھر ادھر جھول رہی تھیں۔ انھوں نے دور ہی سے چلا کر کہا:

"میں نے فرمایا، السلام علیکم میر صاحب!"

میر نہال نے نظر اٹھا کر دیکھا اور قدم روک دیئے اور شیخ محمد صادق نے قریب آکر بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا پھر کہنے لگے:

"میں نے کیا آپ کے مزاج تو اچھی طرح یوں ہیں؟"

میر نہال نے جواباً کہا:

"اللہ کا شکر ہے۔ میاں تم سناؤ کیا حال چال ہے؟"

اس پر شیخ جی بولے:

"ویسے تو خیر صلّا ہے۔ کل میں کچھ دِنوں سے ایسے الجھیڑے میں گھرا ہوا ہوں کہ سوچتا رہا کُل آپ تک آئی نہ سکا۔ کچھ ایسی بے فرصتی تھی۔" اور وہ کبھی ٹانگ

اور کبھی اپنی ڈاڑھی کھجانے لگے۔

"میاں خیر تو ہے، بتاؤ نا؟" میر نہال نے ان کی ہچکچاہٹ کو دیکھتے ہوئے زور دیا۔

"ویسے تو سب ٹھیک ٹھاک ہے پر ایک بات تھی جس کے کارن میں آپ کے پاس تشریف لانی چاہتا تھا۔"

"تو کہو نا شیخ جی!"

"میری ہمت نہیں پڑتی۔ زبان پلٹتی نہیں پر آپ بزرگ ہیں آپ جانیں، میری اکلوتی بہن تھی وہ اللہ کو پیاری ہو گئی۔ ایک بچی چھوڑ مری۔ میں نے ہی اب تو ڑی اس ایتم اسیر کو پالا پرورشت کیا۔ اب سیانی ہونے کو آئی۔ آپ جانیں بڑے کہہ گئے ہیں کہ بن بیاہی بچی گھر میں ہو تو کھانا حرام ہوتا ہے، جب تو ڑی اس کو پرایا نہ کر دیں۔ اب اس کے ہاتھ پیلے کرنا چاہتا ہوں جو آپ اجازت دیں تو بس اتنی سفارش ہے کہ آپ کے ملازم غفور سے اس کے دو بول پڑھوا دوں۔ آپ کو اللہ اجر دے گا۔ دِس ایتم کے سر پہ ہاتھ دھریں گے۔"

میر صاحب نے پوچھا: "بچی کی عمر کیا ہے؟"

"اب ارشاد کر رہا ہوں جی وہ ہے تو تیرھویں میں پر اللہ کا فضل ہے۔ بے فکری سے رہتی ہے۔ اُٹھان اچھا ہے۔ ماشاء اللہ خاصی پندرہ سولہ کی لگتی ہے۔"

میر نہال نے کچھ سوچ کر جواب دیا:

"میاں شیخ جی غفور کے لیے مجھے بچی کی عمر کم معلوم ہوتی ہے۔ آگے تم جانو۔"

"آپ کی عرض تو سر آنکھوں پر پر میری گھر والی نے ناک کی پھننگ میں دم کر رکھا ہے۔ صبح شام اُٹھتے بیٹھتے یہی وظیفہ ہے ہر گھڑی کہتی رہتی ہے تم بے فکرے ہو بچی کا دھیان ہی نہیں کرتے۔ دِس کا کبھی تو سوچو ماشاء اللہ سیانی ہو گئی۔ تم

دلّی کی شام

پڑے ستاتے ہو مجھے رات رات بھر نیند نہیں آتی۔ کب تو ڑی بیٹھی رہے گی۔ اسے پرایا کرو اپنا گھر بسائیے۔ چوبیسوں گھڑی کی کل کل سے حیران ہوں۔ آپ ہی عرض کریں میں وِس نیک بخت سے کیا فرماؤں ؟"

میر نہال ان کی باتیں دلچسپی سے سن رہے تھے کہنے لگے:

"آپ نے غفور کی منشا بھی معلوم کی ؟"

"آپ نے بات تو سولہ آنے ٹھیک کہی ہے۔ مُل آپ کا نوکر ہے مجھے تو یہ بتایئے آپ کی کیا مرضی ہے ؟"

میر نہال ششش پنج میں تھے کہ کیا جواب دیں۔ اتنے میں فاضل خان کرخندار نمودار ہوئے اور میر نہال کو بہت تپاک سے سلام کرکے بولے:

"گھر میں تو سب خیر صلاح ہے"

وعلیکم السلام۔ الحمد للہ"

خیر گزری کہ وہ ٹھہرے نہیں۔ میر نہال نے شیخ محمد صادق سے یہ کہہ کر پیچھا چھڑایا:

"میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی"

شیخ جی اس جملہ کو اجازت سمجھے اور خوشی اور احسان مندی میں میر نہال کے ہاتھ زور سے پکڑ لیے۔

"خدا آپ کو خوش رکھے۔ اس وَخت میری تو بگڑی بنا دی" اور وہ نہال نہال چلے گئے۔

میر نہال نے قدم اُٹھایا ہی تھا کہ سامنے سے ایک ننگ دھڑنگ مست قلندر گلی میں سے نکل آئے۔ ان کی ڈاڑھی سالن اور میل کچیل سے سنی ہوئی بُلبُل کا گھونسلا بنی ہوئی تھی۔ ان کے لمبے لمبے ناخنوں میں میل بھرا ہوا تھا اور وہ سیاہ اور گھناؤنے

ہو رہے تھے۔ پاؤں پر منوں غلاظت تھپی ہوئی تھی۔ قوی ہیکل جسم پر بٹ پڑے ہوئے تھے۔ اور تمام جسم کالے کالے بالوں سے ریچھ کی طرح ڈھکا ہوا تھا۔ چہرے کے بال جھاڑ جھنکار کی طرح اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے تھے جس میں ان کی چھوٹی چھوٹی چیاں سی آنکھیں اور زیادہ چمک رہی تھیں۔ ان کی شکل سے دیوانگی ٹپک رہی تھی۔ مگر لوگ ان کو پہنچا ہوا سمجھتے تھے اور وہ ہمیشہ جواریوں، سٹے بازوں کے نرغے میں رہتے تھے۔ زیادہ تر وہ ہرے بھرے صاحب کے مزار پر پڑے رہتے تھے یا پھر سرمد کے مزار کے سامنے ڈیرا ڈال دیتے۔ کبھی کبھار موج ہوئی تو اٹھ کر شہر کا گشت کر لیا۔ وہ ہمیشہ یہ انوکھی صدا لگایا کرتے تھے:

"جس کے رکھنے میں یہ مزا ہے۔ اس کے نکالنے میں کیا مزا ہوگا"۔

میر نہال کو ان سے وحشت ہوتی تھی اور انھیں آتا دیکھ کر تیزی سے گھر کی طرف چل دیئے۔

ایک بوسیدہ مکان میں کوئی عورت کسی لڑکی پر چیخ رہی تھی:

"اری فطو تجھ پہ خدا کی مار۔ کہاں مر گئی؟"

اور ایک کتے نے بھونک کر بلی کا تعاقب کیا۔

میر نہال کا سر بھاری ہو رہا تھا اور بنّن جان کی طرف سے تشویش تھی۔

انھیں سرمد کی یہ رباعی یاد آ گئی:

سرمد در دین عجب شکستے کردی
ایمان فدائے چشم مستے کردی
عمرے کہ بہ آیات و احادیث گزشت
رفتی و نثار بت پرستے کردی

۲

جب وہ گھر پہنچے تو عصر کا وقت ہو چکا تھا۔ نثار احمد تکبیر کہہ رہے تھے۔ آسمان کبوتروں اور کنکوّوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ دیواروں کے سائے لمبے ہو گئے تھے اور دھوپ منڈیروں اور چھجّوں پر چلی گئی تھی۔ غفور بیٹھا ہوا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ میر نہال نے گھر میں جا کے کیریاں دلچین کو بھلبھلانے کو دے دیں اور خود وضو کرنے لگے۔ کوٹھے پر سے بیگم جمال کی آواز آئی:

"ہائے ہائے میں مری!"

"خیریت تو ہے؟" میر نہال نے دلچین سے پوچھا۔

"بیوی کو بخار ہو گیا ہے۔" دلچین نے کہا۔

میر نہال نے نماز پڑھی اور پھر کوٹھے پر گئے۔ زینہ چڑھتے ہوئے محض اس لیے کھنکھارے کہ ان کی آمد کا پتہ چل جائے۔ آواز سنتے ہی سب نے اپنے ڈھلکے ہوئے دوپٹوں کو سروں پر ٹھیک کیا اور سمٹ سمٹا کر بیٹھ گئیں۔ جمال بیگم اپنے صاف ستھرے پلنگ پر لیٹی ہوئی درد سے ہائے ہائے

کر رہی تھیں۔ جیسے جمال کے کمرے میں ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔ اور دوسری بیویاں نیچے چاندنی پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ مہرو ایک کونے میں جامنی دوپٹہ پر کرن ٹانک رہی تھی۔ اصغر کی شادی کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ بیگم نہال چھالیہ کتر رہی تھیں۔ اور سب باتوں میں اس قدر مصروف تھے کہ جمال بیگم کی مستقل ہائے ہائے اور کراہنے پر کوئی خاص توجہ نہ دے رہا تھا۔ دراصل وہ ذرا سے دکھ اور بیماری میں واویلا بھی بہت مچاتی تھیں۔

میر نہال نے جوتے دہلیز پر اتارے اور بھاوج کے پاس جا کر پلنگ کی پٹّی پر بیٹھ گئے اور نبض دیکھتے ہوئے بولے:

"کب سے بخار چڑھا ہوا ہے بھابی؟"

"بس صبح ہی سے بخار میں بھُن رہی ہوں"

اور پھر وہ کراہتے ہوئے کہنے لگیں:

"بھیجا پھٹ کے رہ جائے گا۔ ارے مجھ کمبخت ماری کو کوئی پانی تو دیدو۔ حلق میں کانٹے پڑ گئے ...... یا اللہ گناہوں کو معاف کر لو...."

میر نہال بھاوج کی ہتھیلی سہلاتے ہوئے بولے:

"گھبرانے کی ایسی کیا بات ہے؟ لو لگ گئی ہے" پھر بیوی سے کہنے لگے اجمل خاں کو بلوا بھیجو۔

جمال بیگم نے دوپٹہ سر پر کس لیا تھا اور کراہتے ہوئے سر کو اِدھر اُدھر پٹخ رہی تھیں۔ بیگم نہال نے میاں سے کہا:

"میں نے تو پہلے ہی ان کو دکھوایا تھا وہ نہیں ملے تو حکیم بھورے میاں کو بلوایا مگر آج وہ بھی کہیں گئے ہوئے ہیں۔ مسرور انھیں لینے گیا تھا۔ وہ غریب بھی بخار سے ہلہلاتا ہوا لوٹا۔ دونوں کو میں نے کیری کا پنّا پلوا دیا ہے

دلّی کی شام

اور اسی کا چھینٹا دے کر لو جھاڑ بھی دی ہے۔ اے تم بولا کیوں رہے ہو۔ اپنی خبر ہی نہیں لیتے، تم بھی پتا پانی لو۔ باہر سے آئے ہو۔ آج لو بہت سخت چل رہی ہے۔"

میر نہال کہنے لگے:

"ہاں کیریاں لیتا آیا تھا۔ دلچین پنّا بنا رہی ہے۔"

پھر وہ نیچے چلے گئے۔ جمال بیگم بدستور ہائے وَیلا کر رہی تھیں۔ نیچے کمرے میں مسرور فرش پر اکیلا بخار میں لوٹھ پوت پڑا تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد پانی پانی کرتا اور پھر غافل ہو جاتا۔ میر نہال نے اس کو پانی دیا اور سر سہلایا۔ اس کی کنپٹیاں دھک دھک پھڑک رہی تھیں۔ کمرے سے نکل کر وہ دلچین پر برس پڑے:

"غریب بچے کو سب نے اکیلا ڈال رکھا ہے، گھر بھر میں کوئی اس کی خبر نہیں لیتا۔ کب سے وہ پانی پانی کر رہا ہے۔ تو بھی نہ گئی۔"

وہ دلچین کو مزید ہدایتیں دے کر کبوتر دیکھنے کوٹھے پر چلے گئے۔

ڈ ڈ ڈ ڈ ڈ

گرم ہوا چل رہی تھی، کھجور کے پتے ایک بے کیف آواز سے سر پیٹ رہے تھے، اور دھوپ کی بے پناہ تیزی میں آنکھیں چندھیائی جا رہی تھیں۔ مگر کبوتر باز پورے انہماک سے ٹین پیٹ پیٹ کر اور زور زور سے سیٹیاں بجا بجا کر کبوتر اڑا رہے تھے۔ پھیری والوں کی آوازیں ٹھہر ٹھہر کر آتیں جو اس گرمی میں بھی لہک لہک کر سودا بیچ رہے تھے۔ فضا اداس اداس تھی اور چار کھونٹ ایک اجاڑ پن تھا....

میر نہال نے جال کا دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی کبوتر پھڑ پھڑاتے ہوئے باہر نکل آئے اور پانی کے خشک کونڈے پر ٹوٹ پڑے۔ پانچ سات کبوتر گرتے پڑتے بڑی مشکل سے باہر نکلے۔ ان میں سے کئی جال میں ڈھیر ہوئے پڑے تھے۔ یہ دیکھ کر میر نہال کا جی بیٹھ سا گیا۔ وہ سب عمدہ نسل کے پٹھے تھے۔

انھوں نے مَرے ہوئے کبوتروں کو اٹھا کر ایک کونے میں رکھدیا اور کونڈے میں پانی بھرا۔ سب کبوتر ایک ساتھ پانی پر ٹوٹ پڑے۔ ہر ایک یہ ہی چاہتا تھا کہ پانی تک اوروں سے پہلے پہنچ جائے۔ بیمار کبوتر کونڈے کی کور پر بہ مشکل چڑھنے کی کوشش کرتے لیکن اس دھکا پیل میں گر گر پڑتے۔ میر نہال نے ان کو دوسرے جال میں چھوڑ دیا اور الگ کنڈالی میں پانی پلایا۔ دو روز پہلے اُن کے ایسے ہی نادر کبوتر لُو لگ کر مر گئے تھے۔ میر نہال کو ان کا ابھی تک قلق تھا کیونکہ ایسے بڑھیا اور سدھے ہوتے جانور دلّی میں کسی اور کے پاس نہ تھے۔ وہ اس ناقابلِ تلافی نقصان سے کچھ ایسے دل برداشتہ ہوئے کہ اس دن انھوں نے کبوتر ایک بار بھی نہ اُڑائے۔

خواجہ اشرف علی اپنی دیوار پر سے اُچک اُچک کر میر نہال کو جھانک رہے تھے اور متعجب تھے کہ آج میر صاحب کو کیا ہو گیا ہے جو کبوتروں کو چکّر تک نہیں دے رہے۔ انھوں نے اپنے کبوتروں کو ایک آدھ بھڑ ہی دی، لیکن میر نہال کے ڈر سے زیادہ دور نہیں جانے دیا۔ جب کبھی وہ ملبی کرتے فوراً انھیں واپس بلا لیتے، اور پھر اُچک اُچک کر دیوار کی منڈیر سے سر نکال اپنی دل جمعی کرنے کو دیکھتے کہ کہیں میر صاحب کبوتر تو نہیں اُڑانے والے ہیں؟ — لیکن میر نہال کے کبوتر چھت پر پھر رہے تھے۔ اب خواجہ اشرف علی کو اطمینان ہو گیا کہ میر صاحب آج کبوتر نہیں اُڑائیں گے اور انھوں نے اپنے کبوتروں کو بے خوف و خطر ملبی کرنے دی۔ میر نہال پر ان اوچھی حرکتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ انھیں تو اپنے کبوتروں کا بہت ملال تھا جنھیں وہ اپنی جان کے برابر عزیز رکھتے تھے۔ اسی لیے اس وقت ان کی حالت اس بچّے کی سی تھی جس کا کوئی نہایت دل پسند کھلونا ٹوٹ گیا ہو اور انھیں کچھ ایسی مایوسی ہوئی کہ انھوں نے ارادہ کر لیا کہ اب اس شوق کو بالکل خیرباد کہہ دیں گے۔ درحقیقت وہ اب جوانی کی سرحدوں کو عبور کر کے بڑھاپے کی منزلوں میں داخل ہو چکے تھے

اور مزید نا امیدیوں کے سہنے کی طاقت باقی نہ رہی تھی۔

تاہم ساری عمر کا شوق یوں آسانی سے چھوٹ بھی نہ سکتا تھا اور انھوں نے اپنے کبوتروں کے مرنے پر ناچار صبر کر ہی لیا اور اگلے دن ہی جمعہ کو نئے پٹھے خریدنے چوک پہنچ گئے۔

ؤ ؤ ؤ ؤ ؤ

مثلث نما چڑھتی ہوئی سیڑھیوں کا سلسلہ جامع مسجد کے شاہی دروازے کے سامنے چبوترے پر ختم ہوتا تھا اور اس چبوترے پر جو سڑک سے تقریباً چالیس فٹ کی بلندی پر تھا کبوتروں کا چوک ہر شام کو لگتا تھا۔ جمعہ کو خاص طور پر بھیڑ بھڑکا زیادہ ہوتی تھی اور بہترین جانور بکنے کو آتے تھے۔ جان پہچان والوں کو علیک سلیک کرتے ہوئے جب میر بہزال نے سیڑھیاں چڑھنی شروع کیں تو داہنی طرف ان کی نگاہ موٹے توندل قفلی والے پر پڑی جو اونچی مُنڈھیا پر بڑے اطمینان سے بالکل چینی گوتم بدھ کی طرح براجمان تھا۔ اس کے موٹاپے کا یہ عالم تھا کہ سوسی کے شلوکے میں سے توند کے بٹ دور سے صاف نظر آ رہے تھے۔ کسی پھونک بھرے غبارے کی طرح اس کے پھولے ہوئے گال گھنی مونچھوں اور خشخاشی ڈاڑھی سے چھپ گئے تھے۔ گہرے نیلے اور سرخ رنگ کے چوخانے والی لنگی اس نے گھٹنوں کے اوپر چڑھا رکھی تھی اور اس کی ترکی ٹوپی جس کا رنگ کبھی لال رہا ہوگا مستقل استعمال اور میل کی تہہ چڑھ جانے سے سیاہی مائل ہو چکی تھی۔ اس کے اردگرد سرکیوں کی نیچی منڈھیوں پر بھڑکیلے کپڑے پہنے ہوئے دلّی کے من چلے بیٹھے ہوئے تھے۔ جب کوئی قفلی مانگتا تو وہ مٹکے کے منہ پر سے سرخ کپڑا سرکاتا اور اس کے اندر ہاتھ ڈال کر قفلی نکالتا اور ٹین کے چاقو سے جس کے دستے کی لکڑی غائب ہو چکی تھی اور اب اُس پر سیاہ چیکٹ دھجی لپٹی ہوئی تھی آٹا کھرچ کر ڈھکنا کھولتا پھر ٹین کا

چچہ لگا کر گاہک کی طرف بڑھا دیتا۔ میر نہال کی نظر شاید اس پر جاتی بھی نہیں اگر خواجہ اشرف علی وہاں بیٹھے ہوئے ملائی کی برف نہ کھا رہے ہوتے۔ خواجہ صاحب دوہرے بدن کے تھے اور ان کی کھچڑی ڈاڑھی کی نوک کھچڑی ہو چکی تھی۔ وہ ملگیا لے رنگ کی شیروانی اور ترکی ٹوپی اوڑھے ہوئے تھے۔ جیسے ہی انھوں نے میر نہال کو سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے دیکھا تیزی سے چمچے چلانے لگے اور بوکھلاہٹ میں برف ان کی ڈاڑھی اور کپڑوں پر ٹپک گئی۔ وہ کھاتے تھے اور مڑ مڑ کر میر نہال کو دیکھتے جاتے تھے۔ بار بار گردن موڑنے میں ان کی ٹوپی کا پھندنا ہوا میں ناچنے لگتا تھا۔ وہ ابھی قلفی ختم کرنے بھی نہ پائے تھے کہ میر نہال چبوترے تک پہنچ گئے خواجہ اشرف علی برف والے کے دام چکا کر جلدی جلدی سیڑھیاں طے کرنے لگے۔

میر نہال بھیڑ کو چیرتے ہوئے پنجروں میں کبوتروں کو جانچنے لگے۔ ایک آدھ مرتبہ تھم کر شوقین بیچنے والوں سے کبوتر ہاتھ میں لے کر ان کی نوک پلک دیکھی اور ان کے سینے مٹھی میں پکڑ کر پر پھڑپھڑائے۔ جو ناپسند ہوئے وہ لوٹا دیئے اور جو بھا گئے وہ نذیر کبوتر باز کے پنجرے میں چھڑوا دیے اور قیمت ادا کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ اس اثنا میں خواجہ اشرف علی بھی آ پہونچے اور کن انکھیوں سے میر صاحب کو دیکھتے رہے۔ میر نہال نے خواجہ صاحب کے دو کبوتر پکڑ لیے تھے۔ وہ بھی نذیر کے پنجرے میں موجود تھے۔ اپنے کبوتروں کو نذیر کے پنجرے میں دیکھ کر ان کا چہرہ سُت گیا۔ وہ اپنے کبوتر میر نہال کے سامنے خریدنے سے کترا رہے تھے۔

انھوں نے میر نہال کو سلام کیا اور مزاج پرسی کر کے کہا:

"کل آپ نے کبوتر نہیں اُڑائے۔ خیریت تو ہے؟"

"شکر الحمدللہ۔ کچھ طبیعت گری گری تھی اور دو چار کبوتر بھی لُو سے مر گئے تھے!"

کبوتروں کے مرنے کا سن کر خواجہ اشرف علی کے چہرہ پر مسکراہٹ کھل اٹھی اور آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ لیکن بہ ظاہر انھوں نے اپنی خوشی کو چھپاتے ہوئے کہا، "جی ہاں! لو بھی تو آج کل کس بلا کی چل رہی ہے۔ جانور تو جانور آدمی بھی مرے جا رہے ہیں۔"

باتیں کرتے کرتے دونوں چبوترے کے دوسرے سرے تک آ گئے۔ نیچے سڑک کے اُس پار ہرے بھرے صاحب اور سرمد کے مزار تھے جن پر سقے مشکیں پیٹھ پر رکھے چھیڑ کا ذکر رہے تھے اور کٹورے بجا بجا کر پانی پلا رہے تھے! اور پریڈ کے میدان کے پرے لال قلعہ کی سرخ سرخ فلک بوس دیواریں دُور تک پھیلی ہوئی تھیں۔

مشرق کی طرف نیچے سیڑھیوں پر چڑی مار طرح طرح کی چڑیاں بیچ رہے تھے۔ جن میں اُلو، بٹیر، بلبل اور طوطے مینا سے لے کر شین باز، نقر نول، لال، بیہ ٹریاں اور ہُد ہُد سب ہی کچھ تھے۔ نچلی سیڑھیوں پر بساطی تھے جن کے پاس رنگ برنگی ننگیاں، کارچوبی ٹوپیاں، موتی اور گوٹے کی ہڑوں کے ازار بند اور چھلے تھے۔ ان سے ذرا ہٹ کر کباڑیے ہر قسم کا پُرانا سامان لیے بیٹھے رہتے تھے۔ اس میں بوسیدہ کتابوں کے قلمی نسخوں کے علاوہ چینی کے برتن قابیں، طشت جاناں، غوریاں اور گلدان تبرنوں پرانے بلّور کے شمع دان، ہنڈیاں اور فانوس، شیشے کی صراحیاں، فتیل سوز، دوشاخے اور سہ شاخے، اور یہاں تک کہ چھپر کھٹ اور میز کرسیاں، بڑے بڑے کاٹھ کے صندوق جن پر پچی کاری، جست کی چادروں پر پھول پتی اور رنگین نقش و نگار بنے ہوئے تھے، سب ہی کچھ تھا۔

شمالی سیڑھیوں اور مقابل کے میدان میں دوا فروش اور جڑی بوٹی والے سانڈھوں اور حواصل کا تیل، شیر کی چربی، ریچھ کے دانت، لومڑی کی دُم اور

مگرمچھ کے منہ اور ریڑھ کی ہڈیاں لیے بیٹھے ہوئے تھے۔ بعضوں کے پاس زندہ گرگٹ، گوہ، سانپ، بچھو، کنکھجورے، نیولے، اور چمگادڑیں تار کے پنجروں اور کاٹھ کے ڈبوں یا بانس کی پٹاریوں میں بند تھیں، ان عطائی نیم حکیم طبیبوں کی جڑی بوٹیاں اور تیل، عرق اور ... کی بوتلیں، چٹکی بھر کی ڈبیاں اور گولیوں اور ٹکیوں کی تھیلیاں، زمین پر پھیلے ہوئے کپڑوں پر بڑے سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ ایک صاحب ناٹک کے روپ دھاریوں کی طرح چیخ چیخ کر اپنی دوائیں بیچ رہے تھے۔ ان کی حیلت پھرت، سرعت، بالکل ایک نقال کی تھی۔ ان کے گرد لوگوں کا ٹھٹھ لگا ہوا تھا۔ پہلے تو وہ دوا کی خاصیت بیان کرتے اور پھر گھیرے کا چکّر لگاتے اور ہتھیلی پر رکھی معجون دوا لوگوں کو دکھا دکھا کر اس کی خوبیاں گناتے۔ جب ایک دوا بک چکتی، تو دوا اونچی ... کر بواسیر کی ... کا لٹکا شروع کرتے :

عجب مرض یہ بھی بواسیر ہے
قضا کا لٹکا کاف میں تیر ہے

اگر یہ دیکھا کہ اس وقت ۔ ۔ ۔ ۔ اس مرض کا مبتلا کوئی نہ تھا تو وہ چورن کے خواص نئے سرے سے دوہرانے لگے،

"بادی کو ایسے کاٹے جیسے ریل کو انجن" دوسری طرف ایک اور صاحب بہروپیے بنے تقریر کر رہے تھے۔ ان کے چاروں طرف بھی جم غفیر تھا۔ وہ اپنے دانتوں پر مَل مَل کر منجن دکھا رہے تھے۔ اور گاگر اس کی تعریفیں سنا رہے تھے۔

ان سے تھوڑی دور جیوتشی، نجومی بیتل اور ہاتھی دانت کے پانسے پھیلائے اور ہاتھ کی لکیروں کے نقشے چوکھٹوں میں رکھے، رمل، جفر کی ہندی اردو کتابیں جمائے لوگوں کی قسمت کا حال بتا رہے تھے اور رستہ چلتوں کو دیکھ کر کہہ رہے تھے "تین کنے چار بات، دل کا بھید بتائے ہاتھ...."

Scanned by CamScanner

چاروں طرف سے مختلف آوازیں آ رہی تھیں۔ چیل کوّے کائیں کائیں کرکے میناروں پر بیٹھتے۔ کبوتروں کے جھلڑ جامع مسجد کے گنبدوں پر سے اُڑ اُڑ کر چلے جاتے یا اور جھنڈ صحن میں اتر کر حوض پر پانی پیتے۔ شام کے وقت دلّی کے شور و شغب میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔

میر نہال اور خواجہ اشرف علی جانے ہی والے تھے کہ حکیم بشیر آ نکلے۔ یہ بھی پرانے کبوتر باز تھے لیکن ان کو گولوں کا شغف نہ تھا جن کی پرواز ایک تو نیچی ہوتی ہے، دوسرے یہ خطِ مستقیم پر اُڑتے ہیں اور اُن کے اُڑانے میں بہت ہو ہا کرنی ہے۔ یہ کابلیوں کے عاشق تھے۔ ایک تو یہ کہ خوب صورت پرندے ہوتے ہیں، ان کی سفید آنکھیں گولوں کی سُرخی مائل ٹیالی آنکھوں سے کہیں زیادہ حسین ہوتی ہیں اور ان کے اعلیٰ بالا ہونے کی شناخت محض آنکھوں کی پتلیوں سے ہوتی ہے۔ ان کا حسنِ پرواز صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ پو کے تڑکے یہ اُڑا دیے جاتے ہیں اور خود بخود بتدریج بلند ہوتے جاتے ہیں اور آخر کار آسمان میں تارا بن جاتے ہیں۔ ان کا زیادہ عرصے تک خلا میں رہنا اس نسل کی امتیازی صفت ہے۔ پھر اُن کے اُڑانے میں نہ جھنڈیاں بلانی پڑتی ہیں نہ سیٹیاں بجانی ——— چونکہ حکیم بشیر خود متین اور صوفی منش آدمی تھے انھیں ایسے سنجیدہ کبوتروں کا شوق ہونا قدرتی امر تھا۔ فضا کی پہنائیوں میں بلند ہوتے ہوئے کبوتروں کو دیکھ کر انھیں ایک خاص کیف و سرور حاصل ہوتا اور وہ محسوس کرتے گویا وہ خود بلند ہو کر قربِ الٰہی حاصل کر رہے ہیں، جس سے ان کی تشنہ روح کو سکون سا آ جاتا۔

حکیم بشیر کے آتے ہی بات کبوتروں کی مختلف قسموں اور اوصاف پر ہونے لگی اور خواجہ صاحب نے بحث چھیڑی:

"حکیم صاحب کابلی تو نشاوروں سے بہتر نہیں ہوتے۔ اس میں شک نہیں

کہ یہ گولوں کی بہ نسبت اونچی اُڑان کرتے ہیں مگر بھئی یہ تو نچلے طبقے کا شوق ہے۔ اوّل تو یہ پاموز ہیں اور پھر سُست۔ اس کے علاوہ ان کے واسطے چھتریاں لگانی پڑتی ہیں۔ یہ ہی حال کابلیوں کا ہے۔ ان دونوں ذاتوں کی دیکھ بھال میں نہ کوئی دشواری نہ سدھانے میں کسی خاص مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔"

حکیم جی میرٹھی تھے اور میرٹھ سے اپنے ساتھ کابلی نسل کے کبوتر لائے تھے، جو دِلّی والوں کے لئے تجربہ ضرور تھے مگر دِلّی والے ان کی خوبیوں کا اعتراف کرنے سے قاصر رہے اور یہ قسم دِلّی میں ابھی تک ہردلعزیز نہیں ہوئی تھی۔ حکیم بشیر نے خواجہ اشرف علی کے طنز پر مسکراتے ہوئے کہا:

"نہیں قبلہ خواجہ صاحب آپ یہ غلط فرما رہے ہیں کہ کابلیوں کے لیے کوئی دردِسری نہیں کرنی پڑتی اور نہ میں یہی تسلیم کرنے کو تیار ہوں کہ یہ نشاوروں سے ملتے جلتے ہیں۔ کسی جانور کا آسمان کی بلندیوں میں بند ہو کر اس طرح اُڑنا کہ آنکھ کو نظر نہ آئے اور پھر سات آٹھ گھنٹے کے بعد گھر آنا کمال کی بات ہے اور پھر ان کی پرواز کی آہستگی اور ٹھہراؤ، واہ واہ!"

خواجہ اشرف علی نے اُلٹ کر جواب دیا:

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ یہ بتائیے ان کو سدھانے میں کون سے ہاتھی گھوڑے جوتنے پڑتے ہیں اور کس ہنر کی ضرورت ہوتی ہے، بس صبح ہوئی کھول دیا اور اُڑا دیے۔ اس کے برخلاف گولوں کو سدھانا کوئی سہل کام نہیں، بڑا پتّا مارنا پڑتا ہے۔ پھر ہم ان کو نہ صرف اُڑنا بلکہ اُڑان کے سینکڑوں طریقے سکھاتے ہیں، ٹکڑیوں میں ایک ساتھ اُڑنا، ٹکڑیوں سے کٹ کر اُڑنا اور تیر کی طرح ایک دوسرے سے الگ ہونا، کڑنیاں لینا، دوسرے کبوتروں کو اس طرح الجھانا کہ وہ کٹنے نہ پائیں، پھر مالک کی آواز کو پہچاننا، سیٹی کی آواز کے ساتھ دھیما اور تیز ہونا،
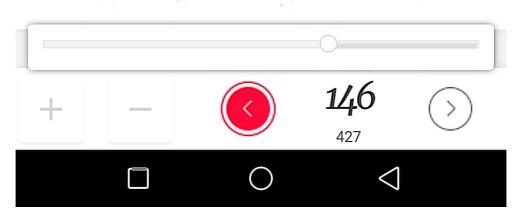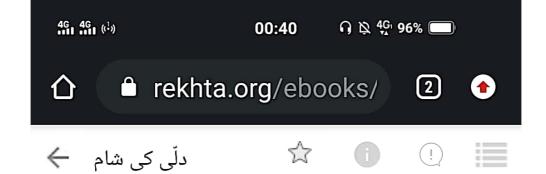
جھنڈی کے اشاروں کو سمجھنا، ارے کہاں تک گناؤں یہ سب سکھانا منہ کا نوالہ تو نہیں ہے اور پھر ان کی غذائیں پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ بادام، پستہ، ملائی کے علاوہ اور طرح طرح کے نسخے دیے جاتے ہیں۔ ارے میاں ان کا شوق ہر کس و ناکس نہیں کر سکتا۔ بڑے دل گردے والوں کا کام ہے۔"

بحث کی گرما گرمی سن کر اور لوگ بھی جمع ہو گئے تھے، اور مزے لے لے کر سن رہے تھے۔ خواجہ صاحب کو اس سے اور تقویت ہوئی اور انھوں نے میر نہال کی جانب اس انداز سے دیکھا گویا میر نہال بھی ان کی ہاں میں ہاں ملا کر ان کی تائید کریں گے۔ مگر میر نہال فقط مسکرا کر رہ گئے اور لطف لینے کے باوجود بحث میں خود کوئی حصہ نہ لیا۔

خواجہ اشرف علی پھر بولے:

"ہمارے میر صاحب کے بڑے بھائی میر جمال ہی کا سن لیجیے جو اس فن میں طاق تھے اور ان کو ایسا ملکہ تھا کہ کیا مجال وہ جس سمت جھنڈی ہلا دیں ان کا کوئی جانور پھیر تو جائے۔ جب سنہ ۱۹۰۱ء کا دلّی دربار ہوا تھا تو جشن کے موقع پر جہاں اور بہت سے کشتی، دنگل، کھیل، تماشے، مرغ اور بٹیر بازیاں ہوئی تھیں وہاں کبوتربازی کے بھی مقابلے ہوئے تھے۔ میر صاحب کو بھی اس مقابلہ میں حصہ لینے کی دعوت دی گئی تھی مگر انھوں نے تو صاف کہہ دیا تھا میں خوشامدی ٹٹوؤں اور رذالوں میں شامل نہیں ہو سکتا مگر جب لوگ بہت ہی مُصر ہوئے تو اس شرط پر راضی ہو گئے کہ ان کے کبوتر ان ہی کی چھت پر سے اڑیں گے اور وقت مقررہ پر لال قلعہ پر مقابلے کے لیے پہنچ جائیں گے۔ سارے کبوترباز شکرموں کی چھتوں کو طرح بہ طرح رنگ کے ان پر سے کبوتروں کو اڑنے کی تعلیم دے رہے تھے۔ بس صاحب مقابلے کے دن یہ ہوا کہ عین وقت پر میر جمال کے کبوتر کڑی کمان کے تیر کی طرح

دلّی کی شام

دور سے آتے دکھائی دیئے۔ تماشائیوں کے منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے اور ایک نعرہ بلند ہوا: "وہ آئے وہ آئے" اور میر صاحب کے کبوتر آئے، دوسری ٹکڑیوں سے لڑتے اور کچھ دیر سب کو ساتھ ملا کر وہیں اڑتے رہے اور پھر تو صاحب ایک فاتح فوج بے شمار مالِ غنیمت لے کر ہزار دس کبوتروں کے ساتھ گھر کو ہو لیے یہ ہے کمال اور فن۔ ہے اس کا کوئی جواب!؟"

اور خواجہ صاحب نے اپنی لکڑی چبوترے کے سنگِ سرخ پر پٹختے ہوئے چاروں طرف بہ انداز فخر اس طرح دیکھا جیسے انھوں نے کوئی بڑا کارنمایاں انجام دیا ہو اور پالا مار کے ان کی اہمیت بڑھ گئی ہو۔ میر نہال اطمینان سے کھڑے ہوئے زیرِ لب مسکرا رہے تھے۔ بعض ساتھیوں نے خواجہ اشرف علی کو تحسین و آفرین سے دیکھا اور بعض رشک بھری نظروں سے ان کو تکا رہتے تھے۔ حکیم بشیر بھی اس قصے سے محظوظ معلوم ہوتے تھے لیکن وہ کم سخن اور سادہ لوح تھے اور خیریت اسی میں دیکھی کہ خاموش رہیں کیونکہ خواجہ اشرف علی کی لفاظی کے آگے ان کی ایک نہ چل سکتی تھی....

دونوں وقت مل رہے تھے۔ آسمان پر ڈھلتے ہوئے سورج کی آخری شعاعیں بادامی رنگ بکھیر رہی تھیں۔ اسی وقت اذان کی آواز آئی اور لوگ ایک ایک کر کے بن شاہی دروازے کی طرف جمع ہونے لگے اور جوتے ہاتھوں میں لے لے کر کھڑکی میں سے جھک جھک کر مسجد میں داخل ہو گئے اور چوک سنسان ہو گیا۔ نماز کے بعد میر نہال گھر جانے کو مسجد کے جنوبی دروازے سے باہر آئے تو شام کا ہلکا ہلکا اندھیرا پھیل رہا تھا اور زندگی کی چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ کہیں پھولوں کی مہک تھی کہیں سیلانی جوڑوں کی چہلیں، ترنم کی آوازیں اور باتوں کی جھنکار۔ ایک میلہ لگا ہوا تھا۔ جنوبی دیواروں کے نیچے کبابی سائبانوں میں بیٹھے کباب

سینخوں پر چڑھا رہے تھے اور کچھ پٹریوں پر بیٹھے دہکتی انگیٹھیوں پر سینکیں سینک رہے تھے اور تکے بھون رہے تھے اور ہوا میں گھی اور چربی کی چراند، بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ اس اشتہا خیز خوشبو سے راہ گیروں کے منہ میں پانی آجاتا اور جب کوئی کباب خریدنے بڑھتا تو کبابی بڑی مشاقی سے قیمہ کو سینکوں پر چڑھا کر کچے دھاگے سے لپیٹ کر سلگتے ہوئے کوئلوں پر رکھ دیتا اور پلٹتا رہتا۔ جب وہ سک جاتے تو سینکوں سے اُتار کر دو ٹکڑے کرتا اور ہرے ہرے دونے میں رکھ کر پیاز اور کیری کا لچھا رکھ اوپر سے کٹی ہوئی ادرک، ہری مرچیں اور ہرا دھنیا چھڑک دیتا، اور گرما گرم دونا گاہک کی طرف بڑھا دیتا۔ جو گھر تک پہنچنے کا صبر نہیں کر سکتے تھے وہ اسی وقت تنوری روٹی یا کلچے سے لگا کر کباب وہیں چٹ کر جاتے یا روکھے ہی کھا لیتے۔ قریب قریب اور کئی خوانچے والے بیٹھے ہوتے تھے جن کے پاس چڑیا کے کباب، تنی کے کباب اور لونگ چڑے بکتے۔ چاٹ والے دہی بڑے، سونٹھ کا پانی، پھلکیاں، آلو چھولے، بیچ رہے تھے۔ کہیں گھوئیاں تلی جا رہی تھیں، کہیں شربت اور فالودے والے میرٹھ کے روغنی پھول دار رنگین پیالوں اور دلّی کے لاکھی برتنوں میں ٹھنڈا ٹھنڈا شربت بیچ رہے تھے۔ لوگ آتے، کوئی شربت سے پیاس بجھاتا کوئی چاٹ کھا کے مرچوں کا مزا لیتا اور اپنی راہ لگتا۔

ٹریم گاڑیاں آآ کر تھوڑی دیر کو رکتیں اور بچے اور یونڈا لاری پرانے ٹکٹوں کو جمع کرنے لگتے اور فقیر مسافروں کو گھیر لیتے۔ کوئی کوئی جیب سے نکال کر یا رومال کی گرہ کھول کر پیسہ دو پیسہ ان کو دے دیتا یا اَن سنی کر کے دوسری طرف بڑھ جاتا۔

میر نہال اس چہچہاتی فضا اور زندگی سے بھرپور نقشے سے بے نیاز گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ ......
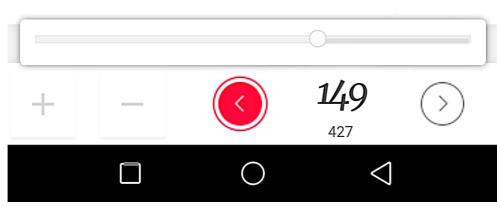
میر نہال ابھی کھانے سے فارغ ہوئے تھے کہ نذیرا آگیا۔ میر نہال کبوتر لے کر چھت پر چلے گئے اور لالٹین کی دھندلی روشنی میں ان کے پر باندھ کر جال میں چھوڑ دیا۔ پھر لالٹین کی لو بڑھا کر نئے خریدے ہوئے پٹھوں کو جال کے اندر بڑے انہماک سے دیکھنے لگے۔ جانور واقعی عمدہ تھے اور وہ اپنے انتخاب پر جی ہی جی میں خوش ہو رہے تھے۔ اتنے میں کہیں سے اُڑتا اُڑاتا ایک چِخنڈ ممٹی پر آکر بیٹھا اور گردن گھما گھما کر گھگھو گھو کرنے لگا۔ چِخنڈ کی آواز پر میر نہال نے اوپر دیکھا اور اس کو اُڑا۔ نے کے لیے گئے۔ اُسی وقت ایک شہاب ثاقب ٹوٹتا اور ایک سرخ لمبی لکیر سی بنا تے آسمان پر چھوڑتا ہوا تیزی سے زمین کی طرف گرتا ہوا دکھائی دیا۔ میر نہال ذرا کی ذرا ٹھٹھکے لاحول پڑھی اور چخنڈ کو اڑا کر جال کی طرف پلٹے ہی تھے کہ غفور ہانپتا کانپتا گھبرایا ہوا آیا۔ جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھنے سے اس کا سانس پھول گیا تھا۔

میر نہال نے پوچھا:

"کیا بات ہے؟"

اور اس نے گھبرا کر کہا:

"ببّن جان بی کے ہاں سے ایک آدمی آیا ہے اور کہہ رہا ہے کہ ان کی حالت خراب ہے۔"

غفور کے منہ سے اتنا سنتے ہی میر نہال کا دل سُن سے ہو گیا اور پاؤں تلے کی زمین نکلتی ہوئی معلوم ہوئی۔ وہ بات جس کا مدتوں سے ان کو کھٹکا تھا جیسے آج ہونے ہی والی تھی۔ وہ اس خبر سے کچھ ایسے سراسیمہ ہوئے کہ انھیں بدحواسی میں جال کا دروازہ بھی بند کرنا یاد نہ رہا اور وہ فوراً ہی نیچے اتر آئے۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

۳

جب میر نہال منی جان کے ہاں جانے کو گھر سے نکلے تو رات کے دس بج چکے تھے۔ لوگ جاگ رہے تھے۔ گو وہ سرِ شام کی رونق اور گہما گہمی ختم ہو چکی تھی مگر چہل پہل باقی تھی۔ کچھ لوگ اپنے گھٹے ہوئے کلھیا سے گھروں اور ان کی چار دیواریوں کی قید سے نکل کر کھلی ہوا میں ادھر ادھر گشت کر رہے تھے۔ چند دوکانوں کے سامنے ہنسی مذاق کر رہے تھے، یا تنبولی سے پان بنوا کر کھا رہے تھے۔ کوئی اکیلا دُکیلا آدمی گلیوں سے نکلتا یا ان میں گھس جاتا تھا۔ ایک راہ گیر سامنے سے آتا ہوا قریب والی گلی میں مڑا اور یا خوفِ تاریکی یا احساسِ تنہائی کی وجہ سے گانے لگا۔

پسِ مرگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلا دیا
اُسے آہ دامنِ باد نے سرِ شام ہی سے بجھا دیا

میر نہال کا دل یکبارگی زور زور سے دھڑ دھڑ کرنے لگا اور بُرے بُرے وسوسوں نے ان کو خائف کر دیا۔ وہ تیزی سے قدم اٹھانے لگے لیکن خوف و ہراس برابر ان کا پیچھا کرتے رہے جیسے کوئی چپکے چپکے بار بار کہہ رہا ہو: "وہ مر جائے گی

وہ مر جائے گی؟ بتن جان کی جدائی کا خیال ان کو شاق گذرا اور وہ یہی سوچتے رہتے کہ اگر وہ چل بسی تو ان کی محبت کا دم کون بھرے گا پھر ان کی پرواہ کس کو رہے گی؟

یہ ضرور تھا کہ وہ گھر بار والے تھے اور ان کی ضرورتوں اور آرام و آسائش کا خیال رکھنے والی ان کی بیوی موجود تھیں۔ لیکن یہ گھریلو دنیا بے کیف و خشک تھی۔ مشغولیت خانگی جھمیلے اور ذمہ داریوں کا بوجھ اور کاہش زندگی کی حقیقتوں میں گرفتار جسم و جان تھے اور تراوٹ سے محروم دل، جس میں نہ چاہ تھی نہ لذت۔ پانچ برس پہلے انھوں نے بتن جان کو محض وقت گزاری اور اپنی دل بستگی کے لیے بطور داشتہ رکھ لیا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ ایک وقت آیا کہ یہ وقتی دل بستگی بڑھتے بڑھتے اس قدر بڑھی کہ دونوں میں رشتۂ محبت استوار ہو گیا اور انھوں نے بتن جان کے ہاں اپنی دنیا الگ بسالی، ایک خواب کی سی دنیا جہاں پہنچ کر وہ اپنے تمام غم غلط کر لیا کرتے اور اپنے تئیں تھوڑی دیر کو بھول جاتے تھے جس سے روح میں نمود اور زندگی کی خواہش تر و تازہ اور شاداب ہو جاتی تھی اور اب پیرانہ سالی میں یہ سارے تکلیف دہ احساسات جراحت دل کا باعث ہو رہے تھے اور ان کو اپنی زندگی کی شام ہوتی دکھائی دی جس میں تنہائی کے سائے طویل اور ویران تھے۔

جب وہ بتن جان کی گلی میں پہنچے تو کسی ڈیوڑھی میں کوئی شخص کھڑا ہوا کسی کو یہ شعر سنا رہا تھا:

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر نہ دیدیم و بہار آخر شد

اور یہ سنتے ہی میر نہال کے ٹھنڈے پسینے چھوٹ گئے۔ اب تو ان کو پورا یقین ہو گیا

کر بین جان ختم ہوگئی۔ وہ قدم رکھتے کہیں تھے اور پڑتا کہیں تھا۔ کچھ دور چلے تھے کہ ایک بلی اچانک کہیں سے نکلی اور ان کا راستہ کاٹتی ہوئی ایک کونے میں دبک کر بے بسی سے میاؤں میاؤں کرنے لگی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی تنہا ہے اور محبت کی بھوکی۔ ابھی وہ چند قدم آگے گئے تھے کہ کسی گھر میں سے نیند میں ڈرے ہوئے بچے کے بلک بلک کر رونے کی آواز آئی جو اپنی ماں کو بے اختیار پکار رہا تھا۔ اس کے بعد ہر طرف سکوت ہی سکوت پھیل گیا۔

جب میر نہال بتن جان کے ہاں پہنچے تو اس کی ماں اکیلی بیٹھی ہوئی چپکے چپکے آنسو بہا رہی تھی۔ یہ دیکھ کر میر نہال کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ ان کے حلق میں کانٹے پڑ گئے اور انھوں نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری اور انا للہ و انا الیہ راجعون کہا اور پوچھنے لگے۔ "کب انتقال ہوا؟" اس کی ماں نے میر نہال کو دیکھا اور بولی:

"آدھ گھنٹہ ہوا!"

پھر وہ پچھاڑیں کھانے اور بین کرنے لگی:

"میرے بڑھاپے کا سہارا وہی تھی۔ میں تنہا رہ گئی۔ اس کے تو ابھی بہاروں کے دن تھے۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ میں کیا کروں۔ یہ منحوس دن دیکھنے کو میں تنہا رہ گئی۔ اب کون ہے جو میرا خیال کرے گا؟" روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔

میر نہال کا اپنا حال شدتِ غم سے غیر تھا لیکن وہ بڑے ضبط سے کام لے کر اسے دلاسا دینے لگے:

"قانونِ قدرت کے فیصلے اٹل ہیں اور حکمِ خداوندی سے سرتابی کی مجال کسی کو نہیں۔ البتہ صبر ان تمام کلفتوں اور اذیتوں کا علاج ہے جو ہمیں

وقت کے ہاتھوں اٹھانی پڑتی ہیں اور اب رونے دھونے سے کیا فائدہ؟"
لیکن وہ برابر روتی رہی۔ ماماتا کے آگے ساری تسلّی تشفی بے کار تھی۔
لہٰذا میر نہال اٹھے اور برآمدے میں آ گئے جہاں ہبّن جان سر سے پاؤں تک چادر سے ڈھکی ہوئی تھی انھوں نے لالٹین اٹھا کر تو بڑھائی اور رسان سے اس کا منہ کھول کر دیکھا۔ اگرچہ وہ مر چکی تھی پھر بھی موت اس کا حسن نہ چھین سکی۔ اس کی بھویں کھنچ کر کماندار ہو گئی تھیں اور اس کے ہونٹ بڑی نزاکت سے ایک دوسرے سے پیوست تھے اور ان پر ایک خموش تبسم تھا جیسے وہ بے ثبات جہاں کی بے ثباتی کا مذاق اڑا رہی ہو اور اس کا چہرہ کچھ اس قدر پُرسکون تھا کہ یہی معلوم ہوتا تھا وہ گہری اور میٹھی نیند سو رہی ہے اور اپنے خوابوں میں اس حقیقی مسرت کا دائمی راز پا لیا ہے جو اس پُر آشوب جہاں میں نصیب نہیں۔

فراوانیٔ رنج و غم سے مغلوب ہو کر میر نہال نے اُس کے منہ پر چادر اُڑھا دی اور لالٹین رکھ کر صحن میں آ گئے۔ ابھی تک اُس کی ماں دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے ساکت و صامت بیٹھی ہوئی تھی اور آسمان کو پتھرائی ہوئی نظروں سے تک رہی تھی گویا اس کے واسطے ہر شئے لایعنی اور بے مقصد ہے۔ میر نہال بھی اس کے پاس آ کر ایک طرف کو بیٹھ گئے۔ اچانک وہ بہت ضعیف اور مغموم نظر آ رہے تھے۔ ان کے اعضاء کی طاقت سلب ہو چکی تھی اور سارا جسم پل بھر میں کاہیدہ، نذار و ناتواں ہو گیا تھا گویا خزاں ان کو چھوتی ہوئی گزر گئی تھی۔

بہت دیر تک میر نہال کہیں دور کھوئے خوابوں اور خیالوں کی دنیا میں غرق رہے پھر آہستہ سے پوچھا:

"تم نے اپنی برادری والوں کو بھی اطلاع کروا دی؟"

"جی ہاں! استاد جی سب کو سنا وُنی دینے گئے ہیں۔ گھڑی بھر میں وہ

سب آجائیں گے اور میرے دل کے ٹکڑے کو مجھ سے جُدا کردیں گے۔"

بیٹی کی یاد میں پھر اس پر رقت طاری ہوگئی اور اس نے دوبارہ آہ و بکا شروع کردی:

"اتنی بڑی دنیا میں یکّا و تنہا رہ گئی۔ اس کا غم میں اکیلی اٹھاؤں گی!" وہ تاسّف سے کبھی ہاتھ ملتی اور کبھی اپنا سینہ پیٹتی۔ غم نے آنسوؤں کی راہ دیکھ لی تھی۔ جب وہ جی بھر کے رو چکی تو اس کی دل کی بھڑاس ایک حد تک کم ہوگئی۔

میر نہال نے اس خیال سے کہ اب اس کے برادری کے لوگ آتے ہی ہوں گے اس کی ماں کو روپیے دیے اور اُٹھ گئے۔ اس وقت ان کا دل سُن تھا اور دماغ ماؤف۔ انھوں نے جاکر مرنے والی پر دیر تک محبت و حسرت کی ایک آخری نگاہ ڈالی۔ ایک سیلِ غم آیا اور ان کی تمام تمنّاؤں اور آرزوؤں کا اندوختہ بہا کر لے گیا اور وہ چراغ جو کچھ عرصہ پہلے ان کے دل میں جل رہا تھا گل ہوگیا۔ انھوں نے اپنے مضمحل اور بے طاقت قدم اٹھائے اور ایک تھکے ماندے مسافر کی طرح وہاں سے لوٹ آئے۔ وہ راہِ محبت مسدود ہو چکی اور وہ بنّن جان جس کی خاطر وہ یہاں آتے تھے موت کی نامعلوم وادیوں میں جا چکی تھی اور اب اس کا کھوج پانا بھی مشکل تھا۔ اس دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی اس کو واپس نہ لاسکتی تھی.....

میر نہال کی صبح جب آنکھ کھلی تو سب سے پہلا خیال ان کو بنّن جان کا ہی آیا اور اس کی یاد آتے ہی دل سے ایک دھواں سا اٹھا اور وہ نڈھال ہوگئے روح غمناک تھی اور چہرہ پژمردہ۔ ان کا جی اپنی جان سے بھی گزر جانے کو چاہتا تھا۔ وہ بہت دیر تک بُت بنے پلنگ پر گم سُم بیٹھے رہے۔ سرگشتگی کا یہ عالم تھا کہ کچھ کرنے کو طبیعت نہ چاہتی تھی، لیکن تا بہ کے۔ کارِ جہاں کے تقاضوں نے مجبور

کردیا اور وہ بہت بے دلی سے اُٹھ کر زندگی کی مصروفیتوں میں لگ گئے۔

جب وہ اپنے کبوتروں کو دیکھنے کوٹھے پر جانے لگے تو سیڑھیوں پر کبوتروں کے پر بکھرے ہوئے نظر آئے اور جب چھت پر پہنچے ہیں تو ہر طرف پر ہی پر اُڑ رہے تھے، اور ہوا نے سمیٹ کر ایک کونے میں پروں کا انبار لگا دیا تھا۔ ان کی نگاہ جال پر گئی جس کا دروازہ وہ رات کو اپنی بے حواسی میں کھلا چھوڑ گئے تھے اور بلیوں نے موقع پا کر دھاوا بول دیا تھا اور جی کھول کر کبوتروں کا قتل عام کیا تھا۔ محض چند کبوتر کسی طرح جان بچا کر باہر اُڑ گئے تھے جو بلّی کا لقمہ بن جانے سے بچ گئے، مگر وہ بھی منتشر پروں کو دیکھ دیکھ کر نیچے اُترتے ہوئے سہم رہے تھے۔ لیکن جب انھوں نے اپنے مالک کو دیکھا تو ایک ایک کر کے اُترے اور ان کے شانوں پر ایک امید میں آ بیٹھے اور میر نہال کی ڈاڑھی میں اپنی چونچیں مار مار کر دانا مانگنے لگے۔ کبوتروں کی اس معصومانہ اور بے خوشامد حرکت میں محبت کا کچھ ایسا انداز تھا کہ میر نہال کا جی بھر آیا اور ان کے سینہ میں ایک تلاطم برپا ہو گیا۔ ان کو اپنی آشفتہ حالی پر ترس آنے لگا اور اس کے ساتھ ساتھ ان کو یوں محسوس ہوا کہ افراطِ رنج اور وفورِ غم سے ان کا دل پاش پاش ہو جائے گا اور سوزِ دروں نے کچھ ایسا پامال کیا کہ صرف ایک بے ثباتی تھی جو انھیں محصور کیے ہوئے تھی۔ ان کے چاروں طرف ناپائیداری کی خندقیں اور ان کے سامنے موہومیِ جہاں کے سوا باقی کچھ نہ تھا۔

کبوتر بازوں کی پرشور آوازیں لگاتار آ رہی تھیں ——— جب کبوتروں کی ٹکڑیاں زنّاٹے بھرتی ہوئی ان کے سر پر سے ہو کر شائیں سے گزرتیں تو پروں کی سرسراہٹ اور پینجنیوں کی سریلی چھن چھن ان کے کانوں میں آتی اور خواجہ اشرف علی کی آواز اوروں کی آواز سے بالا سنائی دیتی۔ مگر انھیں کیا؟

خواجہ اشرف علی ہوں، کبوتر ہوں یا کبوتر باز یا ان کی گوہا اور ہا کو؟ صد حیف ———

کوئی یہاں جاوداں نہیں۔ نہ بہار کو قرار ہے نہ خزاں کو ثبات۔ ہر شے آنی جانی ہے۔ پل بھر میں سب فنا ہو جائے گا۔ دُنیا نقش بر آب ہے اور زندگی حباب...

خاصی دیر تک ان پہ یہی کیفیت طاری رہی، لیکن کبوتر بھوکے پیاسے تھے انھوں نے چونچیں مار مار کر دانے کا تقاضہ کیا۔ باقی کے کبوتر دوسرے جال میں بند تھے جو نتیجۂ اجل سے محفوظ رہ گئے تھے۔ میر نہال نے ان کا جال کھول کر دانا ڈالا اور بچے ہوئے کبوتر بھی اسی جال میں چنے گئے جب وہ دانا دے کر جال کا دروازہ بند کر رہے تھے تو اچانک انھیں خالی جال میں دھب دھب کی آواز آئی جیسے کوئی زور زور سے کود رہا ہو۔ انھوں نے جا کر دیکھا تو ایک خونخوار بلّی جال میں تھی جو رات کو سائے کبوتر ہڑپ کرنے کے بعد جال کے بالائی حصّہ میں اطمینان و بے فکری سے آرام فرما ہو گئی تھی اور اب باہر نکلنے کو اوپر سے کودی تھی۔ جیسے ہی بلّی نیچے کودی میر نہال نے جھپ سے جالی کا دروازہ بند کر دیا۔ پھر جا کر زینہ کے پٹ بھی بند کر کے کنڈی لگا دی اور کبوتر اڑانے کی جھنڈی لے کر جڑا۔ ایسے موقعوں پر ہمیشہ مضبوط اور کارآمد ثابت ہوئی تھی اپنا انتقام لینے بلّی پر پل پڑے بلّی چاروں طرف دوڑ دوڑ کر باہر نکل جانے کا راستہ ڈھونڈ رہی تھی۔ تمام ناکے میر نہال پہلے ہی بند کر چکے تھے۔ چنانچہ بلّی راستہ نہ پا کر جان بچانے کو جال کی تیلیوں پر لٹک گئی اور اوپر سے کود کر جانے کی جدوجہد میں تھی کہ میر نہال نے بلّی کو نیچے اتارنے کے لیے دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلا دیکھ کر اُس نے باہر نکلنے کے لیے جست لگائی اور جوں ہی دہلیز پر پہنچی میر نہال نے بھرپور وار اس کے سر پر کیا۔ بلّی یکلخت لڑکھڑائی مگر ترنت اٹھ کر دیوار کی جانب دوڑی۔ چھلانگ ماری لیکن منڈیر تک نہ پہنچ سکی اور اس نے پنجوں کی مدد سے دیوار پر چڑھنا شروع کیا اگلے پاؤں منڈیر کی کگر تک پہونچ چکے تھے کہ میر نہال نے پھر جا لیا اور اب کے ایسی کاری ضرب لگائی

کر وہ ایک دل خراش میاؤں کر کے نیچے آپڑی۔ لیکن وہ پھر اُٹھی اور اس دفعہ زینے کی طرف لپکی، جب اس کو بھی بند پایا تو پھر پلٹی۔ اس سے پہلے کہ وہ کہیں اور پناہ لیتی لکڑی ٹھیک اس کے مغز پر پڑی اور وہ ادھ موئی ہو کر بے حس و حرکت لمبی لمبی ہاتھ پیر پسار کر پڑ گئی۔ مگر میر نہال کی جچی تلی لکڑیاں تابڑ توڑ اس پر برستی رہیں اور وہ کچکچا کچکچا کر اُسے مارتے رہے یہاں تک کہ ان کے بازو شل ہو گئے اور وہ خود پسینے میں شرابور۔ اس سے بدلہ لینے کی بس یہی ایک صورت تھی۔

بلّی سے اس طرح انتقام لینے کے بعد ان کا دل کچھ ہلکا ہوا اور وہ تعلق جو دنیا سے عارضی طور پر منقطع ہو چکا تھا پھر قائم ہو تو گیا مگر ان میں سے زندگی کی رمق جا چکی تھی، وہ رمق جو فروغ زندگانی کی ضامن ہے۔

وہ اب اتنے بددل ہو چکے تھے کہ اپنے کام پر بھی نہیں گئے۔ جب وہ ہی نہ رہی تو پھر کس کے لیے کمائیں؟ ان کے بیٹے باپ کی خدمت کرنے کے خواہاں تھے۔ بار بار خوشامد کرتے کہ "ابّا میاں آپ کے دن اب آرام کے ہیں، آخر ہم کس لیے ہیں؟" مگر بیٹوں کے مستقل اصرار کے باوجود میر نہال نے اپنا کاروبار ترک نہیں کیا تھا اور وہ اس قدر غیور اور خوددار تھے کہ ان کی حمیّت نے یہ بات گوارا نہ کی کہ چلتے ہاتھ پیروں کسی کے محتاج ہو جائیں، چاہے وہ اپنی اولاد ہی کیوں نہ ہو؟ علاوہ ازیں وہ اپنی کمائی کے خود مالک و مختار تھے جس طرح جی چاہتا خرچ کرتے، جس پر چاہتے اٹھاتے، کسی کی پابندی نہ تھی۔ وہ اپنی آمدنی میں سے بیوی کو سوائے لگے بندھے پاندان خرچ کے کچھ نہیں دیتے تھے کیوں کہ گھر کے اصراف کے واسطے جائداد کا کرایہ معقول اور کافی تھا۔ رہی اُن کی اپنی کمائی تو اس میں سے بیشتر تو بنّی جان کے چاؤ چونچلوں پر اُٹھ جاتی اور جو باقی بچتی وہ ان کے دوسرے شوقوں اور دوست احباب پر خرچ ہو جاتی

اب اس کی ابدی مفارقت سے وہ سرشتہ ہی گم ہو چکا تھا جو جذبات کو لطافت اور اُمنگ عطا کرتا ہے۔

بتن جان کی موت نے ان کا دل مجروح کر دیا اور کچھ ایسا داغ ہوا تھا کہ نومید ہو کر خواہشیں دل سے ہی چلی گئی تھیں، اور اُن کی جگہ یاس و حسرت نے لے لی تھی۔ اب ان کی بلا سے بیٹے اُن کا خرچ اٹھائیں یا کوئی غیر۔ لہذا انھوں نے سہرے سے کاروبار کو بھی طاق پر اٹھا رکھا۔

۴

وہ جب گھر کے اندر گئے تو دلچین نے پوچھا:

"میاں آپ کے کبوتر تو ٹھیک ہیں؟ کل رات کو موئی بلی کہیں سے ایک کبوتر لاکے تخت کے نیچے بیٹھی کھا رہی تھی۔ میں نے جا کر کابک کے کبوتر دیکھے وہ تو سب سلامت تھے۔"

میر نہال نے گمشدگی کے عالم میں گلوگیر آواز سے جواب دیا:

"میرا ہی ہوگا۔ کل رات بلّیوں نے کبوتروں کا صفایا کر دیا۔"

"ہے ہے" بیگم نہال زور سے پریشان ہوتے ہوئے بولیں:

"خدا کی مار بلّیوں پر جان کا عذاب بن گئیں، نہ معلوم دلّی میں بلّیوں کی فوج کہاں سے آگئی۔ کمبخت جال میں کیسے گھس گئیں؟"

میر نہال نے بے پروائی سے جواب دیا:

"رات کو جال کا دروازہ بند کرنا بھول گیا تھا۔"

"بیچارے کبوتر!" مہرو نے افسوس سے کہا: "ابا وہ تو آپ کے سب سے

عمدہ کھو تر تھے نا؟"

میر نہال نے ٹھنڈا سانس بھرا اور بولے :

"ہاں بیٹی ! خیر جو ہونا تھا سو ہوگیا۔"

یہ کہہ کر وہ چپ ہوگئے اور دور باورچی خانے میں دِلچین کو دیکھنے لگے جو کھانا لے کر آرہی تھی۔

جب وہ دستر خوان پر بیٹھے تو انھیں کھانا کھانے کی مطلق خواہش نہ تھی مگر زبردستی نوالے زہر مار کرتے رہے۔ بتن جان کسی طرح ان کو بُھلائے نہ بھولتی تھی بار بار یہی خیال ستاتا تھا کہ دنیا عجب جا ہے، بہت سنگ دل اور خود غرض۔ کل ہی کی بات ہے کہ وہ اس دُنیا میں زندہ تھی۔ روح کا وجود اس میں سمایا ہوا تھا اور حرارت و تمازت سے اُس کی ہستی گرم و گداز تھی اور جسم میں زندگی رقصاں جس کا پرتو اس کے سراپا پر پڑ رہا تھا۔ مگر آج وہ شہرِ خموشاں میں بے خبر سو رہی ہے۔ خاک کا سخت بچھونا اس کے حسین و کومل بدن میں چبھ رہا ہوگا اور اس کے وہ تیکھے نقش و نگار وہ اس کے گلگونہ رخسار موت کی سیاہ چادر میں اپنا حسن اور اپنی رعنائی کھو بیٹھے ہوں گے اور اس کا پیکر خراب و خستہ اور اس کی تمام ہستی ایک رنگ شکستہ ہو چکی ہو گی اور میں جو اس کی زندگی میں محبت کا دم بھرتا تھا یہاں بیٹھا ہوا کس مزے سے لقمے پہ لقمہ اُتار رہا ہوں گویا اس کی موت کوئی سانحہ نہ تھی اور میں اِس زندگی کی ہوا میں شامل ہوں جو چشمکِ پیالہ و ساغر کی طرح پلک جھپکتے ختم ہو جائے گی۔ اور ان کا دل اپنی اس بے حسی پر منفعل ہو کر ملامت کرنے لگا۔ اس وقت اس دنیا کا ذرہ ذرہ تیر و نشتر کی طرح ان کے رگ و پے میں چبھتا ہوا معلوم ہوا جس کی کھٹک میر نہال کی روح تک اُتر گئی۔

آنکھیں طوفان لانے پر تُلی بیٹھی تھیں لیکن انھوں نے انتہائی ضبط سے اپنے

آنسو پی لیے۔ ایک تاسف بھری سرد آہ لبوں تک آئی اور چلی گئی اور دل کا درد دل ہی کو دکھا کر رہ گیا۔ پُرنم آنکھوں سے وہ باہر دیکھنے لگے۔ صحن میں مہندی کی کملائی ہوئی پتیاں اور کاغذوں کے پرزے پھیلے ہوئے تھے۔ ہوا بے پروائی سے آئی اور سب کو ایک ہی جھونکے میں اُڑا کر نالی کے کنارے لگا دیا۔ وہاں سے ہٹ کر ان کی نگاہیں کھجور کے درخت پر پڑیں جس کی پھننگ پر کھلی دھوپ پوری شدّت سے پڑ رہی تھی۔ سورج نے اس کے پتّوں کو پھونک کر خشک کر دیا تھا اور درخت نیم مردہ دکھائی دیتا تھا۔ ہوا جب اس کے زرد پتّوں کو ہلاتی ہوئی گزری تو ایک بے کیف سی کھڑکھڑ کا دھیما شور اُبھرا اور اس میں موت کا راگ اور فنا کا اداس نوحہ نالہ و شیون کرتا ہوا سنائی دیا۔ انھوں نے آہ بھری اور اپنے سے کہا: "میر صاحب راہِ حیات کا آخری موڑ آ ہی گیا۔"

بیگم نہال سامنے بیٹھی ہوئی اپنے میاں کا بغور مطالعہ کر رہی تھیں۔ میر نہال کے چہرے کا رنگ اُڑا اُڑا اور ان کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے جو یاس و حسرت کا پتہ دیتے تھے، وہ سمجھیں کہ شاید میاں کو اپنے جانوروں کا صدمہ ہے۔ وہ کبوتروں کے شیدائی تھے اور کبوتروں کی وجہ سے اکثر دونوں میں نوک جھونک ہو جایا کرتی تھی۔ لیکن آج میاں کا اترا ہوا چہرہ اور انھیں چپ چپ دیکھ کر بیگم نہال کو اس وقت سچ مچ افسوس ہوا اور وہ ایک ہمدرد و غمگسار بیوی کی طرح بڑے خلوص سے دلدہی کرتے ہوئے کہنے لگیں،

"اے تو اس میں آخر ایسی کڑھنے کی کیا بات ہے جو کل سے جی ہلکان کیے لیتے ہو۔ مر گئے تو مر گئے۔ نہ جانے گھر کی کون سی بلا ٹلی۔ موئے وہ بھی کوئی ایسی بڑی چیز تھے، بازار سے اور لے آؤ، نہیں تو نذیر سے کہلوا بھیجو وہ یہیں پہنچا دیگا دنیا یہی آتی جاتی ہے۔ موئے کبوتروں کی موت پر کوئی یوں تمہاری طرح اپنی جان

Scanned by CamScanner

پر بنالیتا ہے ؟"

میر نہال نے بیوی کو کچھ اس بے کسی سے دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں افسوس تم میرے اصل رنج سے بے خبر ہو اور جو کچھ تم سمجھ رہی ہو سراسر غلط ہے۔ مگر انھوں نے بیوی سے محض اتنا کہا:

"تم کہتی تو ٹھیک ہو، مگر یہ شوق ہی اب ختم ہوا!" پھر وہ دسترخوان سے اٹھ کر باہر چلے گئے۔

انھوں نے نذیر کو بلوایا اور اپنا ایک ایک کبوتر فروخت کرنے کو دے دیا۔ پہلے تو نذیر سمجھا کہ میاں یوں ہی کہہ رہے ہیں، لیکن میر نہال کو سنجیدہ دیکھ کر اس کو اچنبھا اور تکلیف ہوئی۔ وہ مِنّت سماجت کرنے لگا، مگر آج میر صاحب کا فیصلہ اٹل تھا اور وہ مجبور ہو کر بادلِ ناخواستہ کبوتر لے کر چلا گیا۔ اور کبوتر بک گئے۔

ؤ ؤ ؤ ؤ ؤ ؤ

بلّی کو غفور سے گلی میں کوڑے کی کراچی پر پھنکوا دیا تھا۔ لیکن شام کو جب میر نہال گلی میں سے گزرے تو دیکھا کہ بلّی موری کے کنارے بیٹھی ہے اور اُنھیں آتا دیکھ کر لنگڑاتی ہوئی ایک کونے میں جا دُبکی۔ میر نہال کو بڑا تعجب ہوا کہ نالی کا پانی اس کے لیے آبِ حیات بن گیا اور وہ کمبخت اتنی شدید چوٹوں کے باوجود زندہ تھی۔ اُن کو اس وقت اس بات کا احساس ہوا کہ زندگی کس قدر سنگین اور سنگلاخ ہے۔ وہ انسان کو بھی اسی طرح پے بہ پے ضربوں پہ ضربیں لگا کر گھائل کر دیتی ہے۔ گو انسان چوٹوں سے بے تاب اور زخموں سے چور چور ہو جاتا ہے۔ مگر کچھ عرصے نزار و نڈھال رہنے، دکھ درد و آزار کھینچنے کے بعد اس میں پھر سے جان داری اور تندرستی و توانائی آجاتی ہے۔

بلّی کو زندہ دیکھ کر انھیں بتن جان بے اختیار یاد آگئی اور اس کی یاد کے

میر نہال نے جواب دیا:

"اللہ کا شکر ہے اور آپ کی عنایت۔ آج کچھ تکان سی ہے۔"

نواب پٹن نے کچھ اور پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ باتوں کا سلسلہ جاری تھا۔ ذوق اور داغ کا کلام زیر بحث تھا۔ تھوڑے توقف کے بعد میر نہال بھی اپنے کو بھول بھال کر گفتگو میں شامل ہو گئے۔ ان کو سب شعرا میں میر تقی میر بہت پسند تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میر کا انداز بیان نہ صرف قدیم وضع اور پرانی روایات کا آئینہ دار تھا بلکہ انھوں نے شاعری میں ایک اچھوتے اسلوب اور دل میں کھب جانے والے نئے رنگ کی طرح ڈالی تھی۔ جب بات تغزل کی نزاکتوں تک پہونچی تو میر نہال نے کہا:

"صاحب میں یہی کہوں گا کہ چاہے اور شعرا نے کتنے بھی خوبصورت شعر کیوں نہ کہے ہوں لیکن جو پُر کیف سادگی اور بے پناہ نزاکت میر کے رنگ میں ہے وہ کچھ میر ہی کا حصّہ ہے۔ اور پھر ان کے عاشقانہ خیالوں کا سوز و گداز، اضطراب و قلق اور حرماں و مایوسی اور میر کے تغزّل کا وہ نمایاں جوہر، اُن کی حسن پرستی کچھ ایسا والہانہ اور انوکھا ہے کہ وہ شاعری میں سب سے الگ تھلگ نظر آتے ہیں کسی میں بھی ان کی ندرت کہاں؟"

نواب پٹن نے محض میر نہال کو چھیڑنے کی غرض سے کہا:

"اور میر صاحب کچھ استاد ذوق کو بھی دادِ سخن عطا ہو۔" حالانکہ وہ جانتے تھے کہ میر نہال کو ذوق کے کلام سے ذرا بھی لگاؤ نہ تھا۔

اس پہ میر نہال برجستہ بولے:

"صاحب ذوق کا کیا ٹھکانہ۔ ان کی تو آپ جیسی ہستیاں شیدا ہیں اور انھیں سراہتی ہیں۔ میں بندۂ ناچیز بھلا ان کی شان میں کیا لب کشائی کر سکتا ہوں؟"
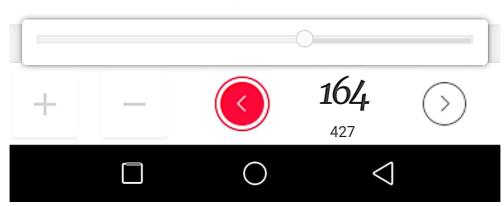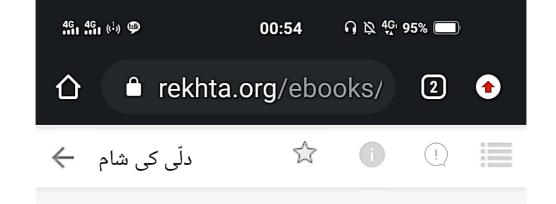
"ارے صاحب آخر ایسی بھی کیا تنگ دلی ہے کہ میرؔ کے علاوہ آپ کسی کی تعریف ہی نہ کریں۔"

میر نہال کہنے لگے:

"حضرت جو سچ پوچھیے تو میں ذوقؔ کے متعلق اتنا کہوں گا کہ وہ محض درباری شاعر تھے۔ چونکہ بہادر شاہ ظفرؔ کے اُستاد تھے لہٰذا ان کا کلام بھی امراء و رؤسا کو مرغوب تھا۔ عوام میں تو وہ زیادہ مقبول نہ ہوئے۔ رہے میر تقی تو ان کا ثانی نہ پیدا ہوا ہے نہ ہوگا ــ مومنؔ اور غالبؔ بھی اس ظالم کی بات پیدا نہ کر سکے۔ میں تو کہوں گا کسی میں نہ آئے گی وہ بات مولوی مَدَن کی سی۔ دِلّی والوں کے ہر دل عزیز شاعر تھے۔ زبان واہ واہ، صاف سلجھی نکھری سُتھری۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں کی منجھی منجھائی زبان ہے۔ ٹکسالی اُردو کے وہی اکیلے جھنڈے اُستاد ہیں۔" اور میر نہال نے میرؔ کے دو چار شعر لطف لے لے کر سُنائے۔

چوں کہ محفل میں نواب سراج الدین خاں سائلؔ بھی موجود تھے اور نواب مرزا خاں داغؔ کے داماد تھے اور اُن کی تعریف و توصیف کے پُل باندھتے تھے نواب پتنؔ نے جولانیِ طبع میں میر نہال سے کہا:

"اچھا صاحب مان لیا آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں اور ذوقؔ درباری شاعروں کے زُمرے میں آ گئے، لیکن اُستاد داغؔ کی شاعری کے متعلق حضور کا کیا ارشاد ہے؟ داغؔ کا طوطی تو عوام میں بول رہا ہے۔ خاص کر زبان اور محاورہ ان کا بھی ٹکسالی ہے۔ ان کی زبان بھی ٹھیٹھ دِلّی کی ہے اس پر ان کی تیکھی بندش اور چُستی اور ان کا بے ساختہ پن۔ میر صاحب میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ داغؔ کا پلّہ بھاری ہے۔ رہا اصناف شاعری کا تو اس میں غم و حسرت کے سوا اور بھی تو چیزیں ہیں۔ زبان کا چٹخارہ، واردات عشق، داغؔ کا وہ شوخ اور عیّار
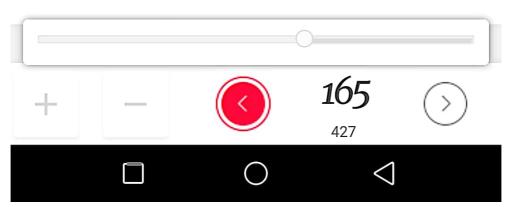
معشوق، اس کی شرارتیں، بے وفائی، اس کا وہ ناز و غمزہ و عشوہ، اپنے جور و ستم پر اس کی بے باک ڈھٹائی، اور پھر مقطع میں تخلص کا برجستہ باندھنا میر صاحب یہ ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔"

میر نہال نے نواب بیّن کی باتوں کا جواب سائل کے لحاظ سے نہ دیا۔ لہٰذا تھوڑی دیر بزم میں خاموشی رہی۔ نواب بیّن نے سب کو پان پیش کیے۔ ایک آدھ نے پیچوان اپنی طرف سرکائے، ایک دو کش لگا کر اپنی طلب بجھائی اور اس کے بعد سائل صاحب نے بہ نظرِ عقیدت یہ اپنا فرضِ عین سمجھا کہ اپنے خسر داغ کا کمالِ فن ثابت کریں۔ لہٰذا نواب بیّن سے مخاطب ہو کر سخن آرا ہوئے۔ ان کی پاٹ دار آواز صحن کے آخری کونے تک واضح اور صاف سنائی دیتی تھی؛

"حضرت آپ نے جو کچھ استاد داغ مرحوم کے لیے فرمایا میں اس کی تائید کرتا ہوں۔ صاحب، استاد کے شعر کیا ہیں معلوم ہوتا ہے رُو بہ رُو بیٹھے ہوئے باتیں ہو رہی ہیں۔ اور زبان؟ زبان کے کیا کہنے۔ واللہ ایک ایک حرف جچا تُلا نپا۔ نگینے کی طرح ترشا ہوا جس کا ہر پہلو مرصع۔ اور میاں کیوں نہ ہو، زبان اور محاورہ ان کے دست بستہ لونڈی غلام تھے جن کو برتنے میں ان کو یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ نواب صاحب، شاعری میں مزہ زبان اور خیال دونوں کا ہے۔ لیجیے استاد کا بس ایک ہی مقطع عرض کرتا ہوں:

اگر نام و نشاں پوچھیں تو قاصد یہ بتا دینا
تخلص داغ ہے وہ عاشقوں کے دل میں رہتے ہیں

بلاشبہ استاد اس فن میں لاثانی و یکتا تھے۔ ہم تو میاں ان کو شاعری میں اپنا پیمبر اور قبلہ جانتے ہیں۔"

سب چپ چاپ سائل صاحب کی گفتگو سنتے رہے اور ان کے ارشاد

کے بعد بحث کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ حاضرین کو لاجواب پاکر سائل کا دل باغ باغ ہوگیا اور وہ داغ کی برتری پر پھولے نہ سماتے تھے۔

مغرب کا وقت قریب تھا اور شام کی سیاہی دھیرے دھیرے بڑھ رہی تھی۔ مکانوں اور پیڑوں کے سائے لمبے لمبے ہوکر گہرے ہو چلے تھے۔

دن بھر کا تھکا ماندا افتادہ آفتاب سکون و آرام کی جستجو میں اس خطۂ خاک کے اُس پار کسی اور حسین اور دلفریب دنیا میں چلا گیا تھا۔ ہوا میں گرد و غبار تھا، اور آسمان تاب و تب سے محروم ہوکر بے رنگ دکھائی دیتا تھا۔ لیکن غروب آفتاب کے ساتھ ہی افق شوخ نارنجی رنگ سے رنگ گیا پھر مدھم روشنی پورے مغربی آسمان پر یہاں سے وہاں تک پھیل گئی جس کے عکس سے ہر شے گلنار ہوکر خوب صورت دکھائی دیتی تھی اور اس سُرخ اجالے میں اچانک احساس ہوتا تھا کہ قلبِ کائنات تھوڑی دیر کو پُر حیات ہوگیا ہے۔

ایک ایک کرکے نواب پتّن کے سب مہمان رخصت ہوگئے اور جب صرف میر نہال اکیلے رہ گئے تو نواب پتّن نے ان کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا:

"میر صاحب اب کے تو بہت دنوں میں یاد فرمایا۔ کہیے بتّن جان کا کیا حال ہے۔ آپ نے بتایا تھا کہ اس کی طبیعت خراب ہے۔"

میر نہال فرش کو دیکھتے ہوئے بولے: "کل شب اس کا انتقال ہوگیا۔"

نواب پتّن یہ سن کر ذرا چونکے اور پھر کہا:

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ یہ تو بُری خبر سنائی۔ اللہ مغفرت کرے۔ سُن کر بڑا صدمہ ہوا۔ کیا ہوا تھا؟"

میر نہال افسردگی سے کہنے لگے: "ایسی تو بیمار نہ تھی کہ پروانۂ اجل آجائے معمولی موتی جھرہ نکلا تھا۔"

نواب پتّن دلجوئی کرتے ہوئے بولے :

"آپ کو تو خیر اس سے جو تعلق تھا سو معلوم ہے، مگر مجھے بھی اس کی مرگِ ناگہاں کا سُن کر خاصی تکلیف ہوئی۔ بالکل جوان تھی۔"

لمحہ بھر کو دونوں پرانے جلیس و ہمدم خاموش ہوگئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اوراقِ ماضی پلٹ رہے ہوں۔ محلّے میں کہیں ایک بچّہ بھوٹ بھوٹ کر رو رہا تھا، اور ایک مرد کے زور زور سے ڈانٹنے کی آواز آرہی تھی۔"

یہ دنیا ایک آئینہ خانہ ہے۔ جس طرف نگاہ اٹھاؤ اپنی ہی صورت نظر آتی ہے یہاں تک کہ اپنے ہجومِ عکس اور کثرتِ تصویر سے انسان خود اپنے آپ سے ہیبت زدہ ہوجاتا ہے۔ اور میر نہال کو یہی معلوم ہوا کہ ابھی ابھی جو بچّے کے رونے کی آواز سُنائی دی تھی وہ دراصل ان ہی کی آوازِ شکست اور ان ہی کے دلِ تباہ کی صدا تھی۔ اس گھڑی بھر میں ان کو ضبط کا یارا نہ رہا۔ صبر و شکیب اس قدر کھنچے کہ ان کا دامن ہاتھوں سے چھوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ ان پر ایک جنون کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ اور ان کا جی چاہتا تھا کہ اپنا دامن تار تار کر دیں اور ایک بچّے کی طرح بے اختیار دھاڑیں مار مار کے رونے لگیں۔ اتنے میں نواب پتّن کے بولنے کی آواز آئی اور وہ ناگوار سکوت ٹوٹ گیا اور میر نہال اپنے آپے میں آگئے۔ نواب پتّن کہہ رہے تھے :

"آپ نے تو میر صاحب کمال کر دیا۔ ذرا دیکھیے تو سہی ایک دن میں صورت کیا سے کیا ہوگئی۔ ایک رنڈی اور اس کا اتنا غم کہ گُھل کر رہ گئے۔ حضرت اللہ کی دی بہت۔ آپ کو کیا کمی ہر ایک اور داشتہ رکھ لینا۔"

اس بات کا جواب میر نہال دیتے بھی تو کیا دیتے۔ نواب پتّن ان کے جذبات کی تہہ تک رسائی نہ کر سکتے تھے۔ دولت اور امارت سے ان میں

رعونت آ گئی تھی۔ قلب و جگر کی واردات وہ کیا سمجھتے۔ محبت ان کے واسطے ایک قلیل متاع تھی۔ یہ خیال ہی ان کے فہم و شعور سے کوسوں دور تھا کہ کبھی کبھی ایک ٹکے کی کسبی کی محبت اور اس کی موت کسی شخص کی دلگیری کا سبب بن سکتی ہے۔ میر نہال صاحب دل تھے۔ محبت کی تھی، اس کا مزہ معلوم تھا۔ وہ محبت کی چبھن اور چبھن کی وہ میٹھی میٹھی دلگداز کسک اور اس کی درد انگیز خلش جانتے تھے اور اس وقت نواب پتّن کی بات ان کو بارِ خاطر تو بہت ہوئی لیکن پاسِ مروّت اور بہ خیالِ دوستی یہ کہہ کر ٹال دی؛

"پتّن صاحب! کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں ابھی جوان ہوں؟ حضرت ذرا میری یہ وضع دیکھیے اور یہ میری عمر دیکھیے۔ اب ہمارے تو یہ دن ہیں کہ کسی گوشے میں بیٹھ کر اللہ اللہ کریں۔"

اسی وقت موذّن نے مغرب کی اذان کہہ کر جیسے میر نہال کے اس کہنے کی پوری پوری تصدیق کر دی۔ نواب پتّن اور میر نہال نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ درختوں کی اونچی اونچی چوٹیوں پر بے گنتی کوّے کائیں کائیں کر کے بسیرے کے لیے جمع ہو رہے تھے اور جنگلی کبوتروں کے غول کے غول عمارتوں اور مکانوں کی چھتوں پر اُتر اُتر کر چھجّوں اور موکھوں میں جگہ تلاش کر رہے تھے۔

نماز ختم ہوتے ہی نواب صاحب کا ملازم پیچوان لے کر حاضر ہو گیا جس کی فرشی نقرئی تھی اور اس پر پیچ رنگی مینا کاری کے پھول پتّے بنے ہوئے تھے اور چنبل کے چاروں طرف چاندی کی زنجیریں لٹک رہی تھیں۔ سٹک اور مُنال پر موتیا کے تازے تازے ہار لپٹے ہوئے تھے۔ نواب پتّن گاؤ تکیہ سے لگ کر غالیچے پر بیٹھ گئے، اور بڑے اطمینان و آسودگی سے حقّے کے کش لگانے لگے، اور میر صاحب سے مخاطب ہوئے:-

"مبارک ہو۔ سنا ہے آپ کے صاحبزادے کی شادی مرزا شہباز بیگ کی دختر سے ہو رہی ہے۔ آپ نے مجھ سے اس کا تذکرہ تک نہ کیا"

میر نہال نے اصغر کو کچھ اس طرح بھلا دیا تھا کہ اس کا خیال ہی اُن کے ذہن سے یوں اتر گیا تھا جیسے اصغر کا وجود کبھی تھا ہی نہیں۔ اصغر بھوپال جا کر برسرِ روزگار ہو گیا تھا اور گھر میں اس کی شادی کی تیاریاں ڈھکی چھپی ہو رہی تھیں۔ گو میر نہال کو ان باتوں کا علم تھا مگر وہ جان کر انجان بنے رہے، اور زیادہ پرواہ نہ کی کیونکہ ایک تو یہ رشتہ ہی انھیں ایک آن پسند نہ تھا اور پھر اجازت تو درکنار کسی نے ان کو کانوں کان بھی خبر نہ کی تھی۔ پھر ان کو کیا پڑی تھی کہ خواہ مخواہ خود پوچھتے اور کچھ کہتے البتہ جو حیرت انھیں ہوئی وہ اس بات پر کہ یہ خبر گھر سے باہر الم نشرح کیسے ہوئی۔ اب اگر وہ نواب متین کے کہے کی تردید کرتے ہیں تو اس کا یہی مطلب ہو گا کہ یا تو میر نہال خود دروغ گوئی کر رہے ہیں۔ یا پھر مرزا شہباز بیگ۔ اور صرف مرزا شہباز بیگ ہی نے نواب متین کو بتایا ہو گا۔ وہ اسی کشمکش میں تھے کہ نواب متین کے اچانک سوال کا جواب کیا دیں۔ چاہے وہ اصغر سے کتنے ہی خفا اور کبیدہ خاطر کیوں نہ رہے ہوں تھا تو آخر اُن کا ہی خون اور ان کا بیٹا۔ بھلا وہ کیسے گوارا کر لیتے کہ غیروں کی نگاہوں میں وہ سبک ہوں، چاہے وہ نواب متین جیسا عزیز اور پرانا دوست ہی کیوں نہ ہو۔ اور اس خیال کے ساتھ ہی ان کے دل میں آئی کہ اصغر کو اس کی حسب مرضی شادی کرنے کی اجازت دے دینی چاہیے۔ اپنی اپنی کھینی آپ پار اُترنی۔ میر نہال نے خود بُری بھلی جیسے تیسے اپنی زندگی تو گزار دی۔ اب ان کو دوسروں کی زندگی سے کیا واسطہ؟ شادی اصغر کی ہو رہی تھی۔ نباہ اسے کرنا تھا اور جب اُسے خود ہی اپنے نیل بگڑ جانے کا خیال نہ تھا تو پھر انھیں دگدا میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ کوئی قیامت کے بوریے سمیٹنے تو بیٹھے نہ رہیں گے۔ ان کی بلا سے اصغر اشرافوں کی

بیٹی لائے یا دھنے جلاہے کی۔ وہ خود تو ستا ئیسویں صدی کے تھے۔ آج مرے کل دوسرا دن۔ اور ان کا ضمیر مطمئن تھا کہ وہ اپنے تمام فرائض اور ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ زندگی کے نشیب و فراز اور بُرائی بھلائی سمجھا دینا یہی ایک باپ کا فرض ہوتا ہے جو وہ خوش اسلوبی سے انجام دے چکے تھے۔ اب اولاد ان کی بات مانے یا نہ مانے۔ حتی المقدور انھوں نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا تھا۔ نہ صرف یہی بلکہ آج تک اسلاف کی نجابت اور بزرگوں کی عزّت و آبرو کو بند ریا کے مُردہ بچّے کی طرح اپنے سینے سے چمٹائے ہوئے تھے اور خاندان میں کسی قسم کی فی نہ کرنے دی تھی جو کسی کو انگلی اٹھانے کا موقع ملتا۔ لیکن کس لیے اور کیوں؟ ان کو کیا ملا۔ زندگی ان پر کون سی مہربان ہوئی اور مقدر نے ان کے ساتھ کونسا اچھا سلوک کیا جو انھیں اب کوئی ارمان اور تمنا ہو؟ اس آخری وقت میں اگر ان کا بیٹا بھی پَر پُرزے نکال کر ان کے ہاتھوں سے جاتا رہے تو یا تقدیر یا قسمت۔ مقدر کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ جو ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ رنج و افسوس لے بنیاد ہیں۔

پھر کیوں نہ ہنس کر ہر تلخی کو گوارا کر لیں۔ اگر اصغر کی شادی ان کی بے اجازت ہو گئی تو پھر ان کی بزرگی اور ان کی اپنی حقیقت کیا رہ جائے گی؟ حالات کو بد سے بدتر بنا کر مفت کی جگ ہنسائی اور ذلت و خواری اٹھانا کہاں کی عقلمندی ہے؟ اب انھیں محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے ضعیف اور بوڑھے شانے بارِ گراں اٹھانے کے قابل نہیں رہے۔ جوانی کے جاتے ہی زندگی کا طنطنہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ وہ سب باتیں بھولے بسرے خواب ہو گئیں اور اس بڑھاپے میں جو حقیقت باقی رہ گئی تھی وہ میر نہال کی ذرا سی خودی تھی۔ اس چھوٹی سی شمع کو انھوں نے تمام عمر زیرِ داماں رکھ کر ہر حادثہ اور طوفان سے بچایا تھا۔ اور جس طرح باعزّت وہ اُس کے اجالے میں جیے تھے اب اسی اُجالے میں اسی خودداری سے اس دارالفنا کو الوداع

کہہ کر موت کا خندہ پیشانی سے استقبال کرنا چاہتے تھے۔

برق کی لہر کی طرح آن واحد میں یہ سارے خیالات ان کے دماغ میں آئے اور ان کو ایک نئی ہمت دلا کر صابر و متحمل بناتے ہوئے گزر گئے۔ چنانچہ میر نہال نے نواب مِٹّن سے کہا:

"بھلا یہ ممکن ہے کہ اصغر کی شادی ہو اور آپ کو اطلاع نہ کی جائے۔ شادی ابھی بہت دور ہے۔ میں اپنی گتھیوں میں ایسا الجھا رہا کہ ادھر دھیان ہی نہ دیا۔"

گھر پہنچتے ہی انھوں نے اپنی بیوی کو بلا کر اجازت دے دی کہ اصغر کا جہاں جی چاہے اس کی شادی کر دو۔

۵

مصائب و آلام کے باوجود انسان زندگی سے رشتہ استوار کرلیتا ہے، کیوں کہ زندگی کے بہاؤ کا ہر حالت میں آگے بڑھنا لازمی ہے۔ میر نہال بھی قسمت پر صابر و شاکر ہو کر حسبِ معمول زندگی گزارنے کے خوگر ہو گئے۔ یہ ضرور تھا کہ وہ کام پر نہ جاتے تھے اور کبوتر اڑانے کا شوق ان کی دیرینہ خوشیوں اور یادوں کے ساتھ دائمی نیند سو گیا تھا۔ یہ عہدِ رفتہ کی باتیں تھیں اور ماضی کو وہ بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ اب زندگی کی راہ دھندلی اور کٹھن تھی مگر وہ ہمت اور استقلال سے تنہا اس پر چلنے کو تیار ہو چکے تھے۔

بیکاری میں، بیٹھے بیٹھے حکمت کا پرانا ذوق پھر تازہ ہو گیا، اور ایک دن انھوں نے صندوق کھول کر وہ ساری حکمت کی بیاضیں اور کاغذات نکالے جن میں کبھی دوائیں اور نسخے درج کر لیے تھے۔ انھیں کتابوں میں کیمیا بنانے کی یادداشتیں بھی موجود تھیں۔ اور وہ وقت جو خالی بیٹھے بیٹھے گزارنا ان کو وبال جان تھا، بڑی دلچسپی میں کٹنے لگا۔ وہ صبح سے شام تک بڑی محویت سے دوا دارو بنانے میں
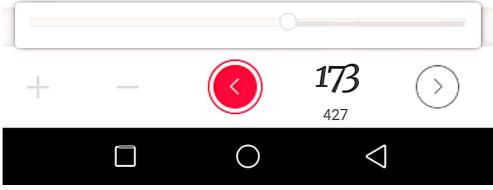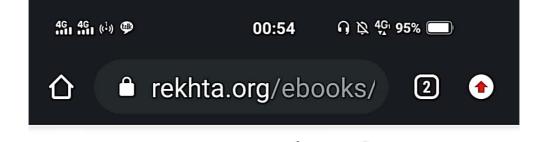
مشغول رہنے لگے۔ پیٹ کے درد سے لے کر فالج، لقوہ اور کھانسی کی گولیاں، چورن اور تیل تیار کیے جاتے۔ انواع و اقسام کی جڑی بوٹیاں جمع کر کے احتیاط سے شیشوں اور ڈبوں میں بند کی جاتیں۔ پھر یہ سلسلہ اتنا بڑھا کہ ان کے پاس ایسے فقیروں اور دوستوں کا مستقل جمگھٹا رہنے لگا جو جڑی بوٹی کے سینہ بہ سینہ آئے ہوئے مجرّب نسخوں کے مالک تھے۔ ان ہی میں چھو سوں نے بھی آ نا جانا شروع کر دیا جو کیمیا کے دھتّی اور عمر کا سنہری حصّہ اس کے حصول میں رائیگاں کر چکے تھے۔ یہ لوگ بیٹھ کر آپس میں تبادلۂ خیالات کرتے۔ جڑی بوٹیوں کے اوزان پر بحث ہوتی، ماہیت و خواص پر تبصرے، اور نسخوں پر مکرّر نظر ثانی کی جاتی۔ کبھی ترمیم و اضافے ہوتے اور کبھی کاٹ چھانٹ اور جیسے جیسے یہ دور کے ساتھ ساتھ پیر فقیر، سائیں گسائیں، جوگی یوگی اور اللہ والے باکمال لوگوں کے عجیب و غریب قصے اور ناقابلِ یقین حکایتیں بیان کرتے۔

اس دلچسپ جماؤ میں ایک شخص میر سنگی بھی آیا کرتے تھے ان کا سر گنجا تھا اور کالے تامڑے پر سفید چھوٹے چھوٹے بال باقی رہ گئے تھے جو بالکل جھگا ڈر کا رُواں نظر آتے تھے۔ کسی زمانے میں یہ امیر و کبیر رہے تھے لیکن کیمیا گری کے شوق میں ان کی دولت اور تمام اثاثہ پھونک چکا تھا لیکن انھیں سونا بنانے میں ایک دفعہ بھی کامیابی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ مگر اس کی جستجو میں جنونِ شوق وہی تھا۔ اس قماش کے آدمیوں میں لال شاہ بھی تھے۔ لمبی ڈاڑھی ہمیشہ سُرخ رنگی رہتی تھی اور اس کی وجہ سے یہ لال شاہ کہلانے لگے تھے جس قدر ناک اونچی اور نمایاں تھی آنکھیں اسی قدر چھوٹی چھوٹی۔ سارا چوکا تو جا چکا تھا لیکن سامنے کے دانت سلامت تھے جن پر کھانے کے ذرات ریخوں میں چپکے ہوئے دکھائی دیتے تھے اور دانتوں پر پھپھوند آ کر بالکل زرد ہو گئے تھے اور بلا مبالغہ ان کو دیکھ کر گھوڑے کے بڑے بڑے

دانت باد آجاتے تھے۔ ان کی سیاہ فام رنگت میں جگہ جگہ کالونس کے گہرے دھبے کچھ اس طرح چمکتے تھے جیسے وہ کسی جلدی مرض میں مبتلا ہوں اور جو سب سے زیادہ مضحکہ خیز بات ان کی ذات میں تھی وہ یہ کہ وہ اس رنگ و روپ پر سفید کنٹوپ اوڑھے رہا کرتے تھے۔

ایک روز میر نہال بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ میر سنگی مولوی دُلہن کو لے آئے۔ یہ سدا سہاگن تھے، سُرخ ساڑھی، ہاتھ بھر کے چھنچھناتی ہوئی سبز سُرخ چوڑیاں، عورتوں کی طرح پیٹھ پر لمبی لمبی لٹیں جو خوشبودار تیل میں ڈوبی ہوئی تھیں اور کمر تک آرہی تھیں۔ آنکھیں سُرخ مگر کاجل سے کجلائی ہوئی۔ بظاہر دنیا سے ناطہ توڑ کر سچے پیا سے جوڑ لیا تھا اور اللہ میاں کی دُلہن کہلانے لگے تھے لیکن کیمیا بنانے کا نشہ ابھی ہرن نہ ہوا تھا۔ میر نہال نے ان کو بارہا دیکھا تو تھا مگر ان کے اس شوق کا علم نہ تھا۔ وہ تو میر سنگی نے کسی طرح سُن گن پالی تھی تو میر نہال کے ہاں لے آئے۔

مولوی دلہن نے بڑے رازدارانہ انداز میں پوچھا:

"آپ کو اس نسخہ کا علم ہے جو جامع مسجد کے شمالی دروازے پر کندہ ہے؟"

لال شاہ بتیا بانہ بولے:

"ہاں قبلہ جانتا ہوں اور مدتیں بلکہ اپنی عمر اس کی تلاش میں برباد کی ہے لیکن قبلہ آپ کچھ بتا سکتے ہیں کہ اس نسخے میں وہ کیا چیز ہے جو نہیں لکھی ہے۔ ہوگی تو اڈھی کی چیز مگر ہنوز معلوم نہ ہوسکی۔ اگر اس بُوٹی کا اتا پتا مل جائے تو سبحان اللہ پھر تو ساری مشکل ہی آسان ہوجائے۔"

مولوی دُلہن کہنے لگے:

"ایک دفعہ مجھے ایک بزرگ نے وہ چیز دکھائی تھی جو جامع مسجد والے نسخہ

میں" آدھی کی وہ و کے نام سے دی ہوئی ہے۔"

"آخر وہ کیا تھی؟" لال شاہ بڑی جستجو اور اشتیاق سے پوچھنے لگے۔ مولوی دلہن بولے:

"تھا کیا۔ یہ ایک سُنہری پھول تھا جس کی پنکھڑیوں پر سُرخ سُرخ ٹیکے اور بُندکیاں نگینے کی طرح جڑی تھیں۔"

"صاحب اس کا نام کیا تھا؟" میر نہال بھی دلچسپی سے پوچھنے لگے، کیونکہ انھیں بھی ایک ایسا ہی پھول دیکھنا یاد آگیا، جس کا نام شب چراغ تھا۔ مولوی دلہن بولے:

"مجھے اس کا نام تو یاد نہیں رہا شاید عطرِ زریں تھا۔ یہ جب کی بات ہے جب مجھے یہ گمان بھی نہ تھا کہ مجھے بھی کیمیا بنانے کا شوق چرّائے گا۔ کم سنی کا زمانہ تھا۔ میں اپنے ماموں کے پاس ایک گاؤں میں رہا کرتا تھا۔ ایک دن یہ شاہ صاحب اپنے پھیرے پر آئے اور گاؤں کی مسجد میں قیام کیا۔ بچپن سے مجھے صوفیوں اور فقیروں سے والہانہ عقیدت اور لگاؤ تھا۔ بس میں شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر رہنے لگا۔ ان کے پاؤں دباتا، کھانا کھلاتا اور ان کی ہر چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کو بہ دل و جان پورا کرتا۔ مجھے ان سے رُوحانی اُنس و محبت ہوگئی اور وہ بھی مجھ پر مہربان رہنے لگے۔ ایک دن کی بات ہے کہ میں اکیلا تھا۔ مجھ کو اپنے پاس بلایا اور اپنے جھولے میں سے وہ پھول نکال کر دکھایا اور کہا بچّہ یہ ہی وہ چیز ہے جس کا نام جامع مسجد والے نسخے میں سے غائب ہے، اور یہ ہی کیمیا کا اصل جُز ہے۔" میں کھڑا کھڑا اشتیاق اور حیرت سے اس پھول کو دیکھتا رہا۔ پھر انھوں نے کہا:

"پہچان لو۔ کبھی بُرا وقت آن پڑے تو اس پھول سے سونا بنا لینا۔ مولا چاہے تو بیڑا پار ہو گا۔"

Scanned by CamScanner

میر نہال مولوی دلہن کی بات کاٹ کر کہنے لگے:

"کیا آپ کے ان شاہ صاحب نے یہ بھی فرمایا تھا کہ وہ پھول کس جگہ دستیاب ہو سکتا ہے؟"

مولوی دلہن نے وثوق سے کہا:

"جی ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ شاہ صاحب نے بتایا تھا کہ یہ پھول راجپوتانہ کی پہاڑیوں میں ملتا ہے۔ وقت وقت کی بات ہے۔ جب مجھے اس کی قدر نہ تھی تو غیب سے مدد ہوئی۔ اس کے بعد سینکڑوں مرتبہ اس پھول کو تلاش کیا......؟

اتنا کہہ کر وہ رُک گئے۔ سب ہمہ تن گوش ہو کر اس پُراسرار پھول کی باتیں سن رہے تھے۔ ان کی خاموشی پر سب کی نگاہیں مولوی دُلہن پر جم گئیں اور ان کے دل اس خیال سے بلّیوں اچھل رہے تھے کہ بس اب کیمیا کے راز کی عقدہ کشائی ہوئی اور اب ہوئی۔ کمرے کی فضا ساکت تھی اور امید و بیم کی گھڑیاں گزارنی مشکل ہو رہی تھیں۔ مولوی دُلہن کے ایک جملے پر کیمیا کا دار و مدار تھا۔ وہ لوگ سدا سہاگن کے دوبارہ نہ ملنے کے انتظار میں تھے۔ مولوی دلہن اپنی انگلیوں کو جن میں پور پور چھلّے اور انگوٹھیاں تھیں دیکھ رہے تھے آخر آہستگی سے کہنے لگے:

"اس کے بعد سینکڑوں مرتبہ اس پھول کو تلاش کیا۔ اس جیسے ہزاروں پھول تھے لیکن جو شاہ صاحب نے مجھ کو دکھایا تھا وہ نہ تھا۔ میں نے ان شاہ صاحب کی تلاش میں صحرا نوردی کی لیکن آج تلک دونوں میں سے کسی کو نہ ملنا تھا نہ ملے"!

اس گفتگو کے ساتھ ہی وہ شوق جو سب کے دلوں میں موجزن تھا پُر حسرت تمنا بن گیا ـــــ کاش وہ پھول مل جاتا۔

کافی توقف کے بعد میر نہال نے میر سنگی سے کہا:

"یہ وہی پھول ہوگا جو مجھے اس لوہار نے دکھایا تھا۔"

لال شاہ پڑ داوی دلہن کے قصے کا بڑا اثر تھا، لیکن میر نہال کے اس جملے پر ان کے کان کھڑے ہو گئے اور انھوں نے پوچھا:

"میر صاحب کون سا پھول ؟ کیا آپ نے کبھی دیکھا ہے ؟"

میر نہال نے کہا:

"اللہ مغفرت کرے ماموں جان مرحوم بڑے خدا رسیدہ بزرگ تھے جوانی ہی میں انھوں نے دنیا کو چھوڑ دیا تھا۔ عشقِ الٰہی میں مضطرب و بے قرار رہتے تھے۔ ایک دن یہ بے قراری اس قدر بڑھی کہ چپکے سے گھر سے نکل گئے۔ برسوں دشت و بیاباں میں روپوش رہے، اور جب دُرویشی کی تمام سنگلاخ منازل طے کر لیں تو راجپوتانے کی گھاٹیوں میں مسکن بنا لیا، اور وہیں اللہ اللہ کرنے لگے۔ ماموں جان سونا بنانے کے راز سے بھی واقف تھے۔ مجھ کو تو یہ بات اتفاقاً اس طرح معلوم ہوئی کہ اللہ بخشے ماموں کے انتقال کے کوئی بیس برس بعد میرا جانا راجپوتانہ ہوا۔ میں ان کی قیامگاہ جو لق و دق پہاڑوں میں تھی گیا۔ اب وہیں آپ کا مزارِ مبارک ہے۔ وہاں ایک شخص سے ملنا ہوا، جو ذات کا لوہار تھا لیکن بعد میں میرے ماموں کا مرید ہو گیا تھا۔ جب اُس کو یہ معلوم ہوا کہ میں اُس کے پیر و مرشد کا بھانجا ہوں تو اُس نے وہ پھول مجھ کو دکھایا۔ وہ خود سونا بناتا تھا۔ یہ علم میرے ماموں نے اس کو سکھایا تھا اس پھول کو شب چراغ کہتے ہیں۔ اللہ اللہ اس کا سنہری رنگ آج تلک نگاہوں کے سامنے پھرتا ہے۔ کندن کی دمک اس کے سامنے ماند تھی۔ وہ لوہار ایک مرتبہ مجھے بھی اپنے ساتھ لیکر وہ پھول لینے گیا تھا۔ یہ پھول چاند کی آخری تاریخوں میں کھلتا ہے۔ اس دن گھپ اندھیری رات تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دیتا تھا۔ پہاڑ پر چڑھنا تھا، راستہ انتہائی خطرناک اور جنگلی جانوروں کی آوازیں دل ہلائے دیتی تھیں۔ جب ہم ڈھلان پر پہونچے تو لوہار مجھ سے کہنے لگا اب ہاتھ پاؤں کے بل چلو اور ہم کھسک کھسک کر

آگے بڑھنے لگے اور جب ہم اس اصل جگہ پہونچے جہاں وہ پھول کھلتا تھا تو وہ آہستہ آہستہ سرکنے لگا بالکل اس طرح جیسے بلّی اپنے شکار کی طرف بڑھتی ہے اس کے ایک ہاتھ میں رومال تھا اور دوسرا ہاتھ ہوا میں بلند۔ وہ مجھ سے کہنے لگا کہ صرف وہ پھول ہمارے کام کے ہیں جن میں جگنو کی سی روشنی کی ہلکی ہلکی شعاع لپکتی نظر آئے یا وہ جو کبھی کبھار جگمگا اُٹھیں۔ وہ ہاتھ ہوا میں اُٹھائے ہوئے اسی طرح بڑھتا رہا جوں ہی کوئی چیز چمکتی وہ فوراً نوچ لیتا تھا اور اپنے رومال میں رکھ لیتا۔ بڑی دیر تک وہ پھول توڑ توڑ کر جمع کرتا رہا اور جب اس کا رومال بھر گیا تو ہم وہاں سے واپس ہوئے۔ پَو پھٹنے والی تھی۔ گھر پہونچ کر وہ پھول میں نے اجالے میں دیکھا۔ مولوی صاحب نے جس پھول کا تذکرہ کیا تھا یہ ہو بہو اس کا مشابہ تھا۔ لوہا راور جڑی بوٹیوں کے ساتھ کیمیا پھونکنے کی تیاری کر رہی رہا تھا کہ مجھے عجلت میں دلّی واپس لوٹنا پڑا اور سونا بنانے کا طریقہ اپنی نگاہ سے نہ دیکھ سکا۔۔۔۔۔؟

لال شاہ کفِ افسوس ملتے ہوئے مَری ہوئی رسی آواز میں بولے:
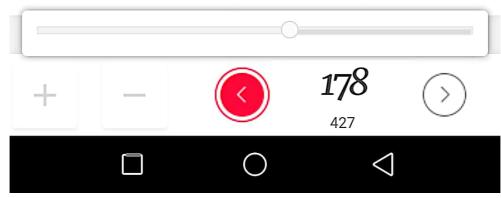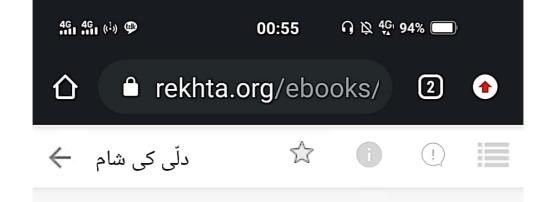
"واللہ میر صاحب کیسی غلطی ہوئی۔ علمِ عظیم اللہ تعالیٰ خود آپ کو عطا فرمانا چاہتا تھا اور آپ نادانی میں محروم رہے۔"

میر سنگی نے بھی ایک لمبی اور ٹھنڈی آہ بھری اور اپنی چچا زاد بہن کا قصّہ سنانے لگے جنہوں نے بچپن میں ایک دفعہ چاندی بنائی تھی:

"ہوا یہ کہ ایک دفعہ وہ اپنی ہمجولیوں کے ساتھ کوٹھے کی چھت پر گڑیاں کھیل رہی تھی۔ وہ سب مل کر اپنی گڑیا کے واسطے رانگ کا زیور گھڑ رہی تھیں۔ ایک کرچھے میں رانگ بھر کر انھوں نے آگ پر رکھ دیا۔ جس وقت رانگ گرم ہو کر پگھل گیا تو یہ کسی کی عقل میں نہ آیا کہ اس کو ٹھنڈا کس طرح کیا جائے۔ کم عمری بھی عجیب ہوتی ہے۔ اور تو کچھ انھیں سجھائی نہیں دیا، چھت پر جو خودرو بیل بوٹے برسات

میں آگ آئے تھے کچل کر ان کا عرق رانگ پر ڈال دیا۔ بس عرق کا ڈالنا تھا کہ زور سے چھن سے
ہوئی اور رانگ بیٹھ گیا اور کڑچھے میں جم کر رہ گیا۔ میری بہن بہت گھبرائی کہ اماں سنیں گی تو
صلواتیں سنائیں گی۔ مارے ڈر کے اس نے کڑچھا باورچی خانہ میں چھپا دیا۔ تھوڑی دیر
کے بعد سہ پہر کو چچا ابا کو چلم بھرنے کے لیے آگ کی ضرورت ہوئی تو انھوں نے کڑچھا
ڈھونڈا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ اس کے اندر چاندی کا ڈلا پڑا چمک رہا ہے۔ پھر تو انھوں
نے پوچھ گچھ شروع کی اور معلوم ہوا کہ یہ کارنامہ ان ہی کی صاحبزادی کا ہے۔ ادھر جاکر
ساری جھاڑی کی بوٹیاں دیکھیں کہ آخر یہ کرشمہ کس بوٹی کا تھا۔ لیکن بچیوں نے کوٹ
پیس کر ان کا ایسا ملیدہ کیا تھا کہ گھور گھور کر دیکھنے پر بھی پہچان نہ ہو سکی۔"

میر سنگی یہ قصہ سنا ہی رہے تھے کہ کمبل شاہ موٹا سا ڈنڈا بجاتے ہوئے
دیوان خانے میں آ گئے۔ اپنی وضع کے یہ بھی ایک ہی تھے۔ یہ افغانستان کے باشندے
تھے اور اردو ٹوٹی پھوٹی بولتے تھے۔ ٹخنوں سے اونچا تہبند باندھتے اور ایک کمبل تیسوں
دن اوڑھے رہا کرتے تھے۔ برسات جائے جاڑا آئے جیٹھ بیساکھ ہو ان کا کمبل بدن سے
جدا نہ ہوتا تھا اور وہ کمبل بھی عجوبۂ روزگار تھا۔ ہر رنگ کی کترن اور ہر قسم کے کپڑے کے
ستر ہزار پیوند اس میں لگے ہوئے تھے۔ لحیم شحیم اور قد آور تو تھے ہی اس پر ان کی لمبی سی
گھنی سیاہ ڈاڑھی نے ان کو اس قدر پر جلال بنا دیا تھا کہ لوگ انھیں دیکھتے ہی مرعوب
ہو جاتے تھے۔ ان کے لیے مشہور تھا کہ انھوں نے سارے مدارج طے کر لیے ہیں اور
اب درویشی کا رتبہ حاصل ہے۔ عام طور پر کاملین اپنی کرامات کسی پر ظاہر نہیں ہونے
دیتے۔ کمبل شاہ سدا ننگے سر اور ننگے پاؤں پھرتے تھے اور لوگ کہتے تھے کہ وہ اس
قدر پہنچے ہوئے ہیں کہ آج تک ان کے قدم کا نشان کسی نے زمین پر پڑتے ہوئے
نہیں دیکھا۔ میر نہال سے ان کی ملاقات اس زمانے سے تھی جب وہ شروع شروع
افغانستان سے آ کر میر نہال کے ایک قریبی عزیز کے ہاں ٹھہرے تھے۔ میر نہال
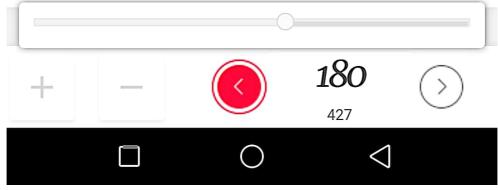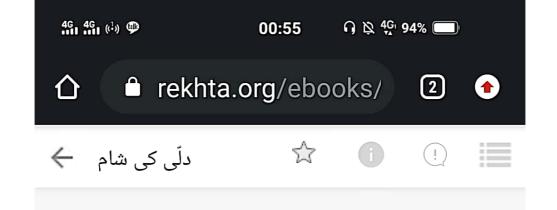
سے ان کو خاص اُنس ہو گیا تھا اور اکثر ملتے رہتے تھے۔ ان کو کیمیا سے کوئی سروکار نہ تھا بلکہ اس کی مذمت کیا کرتے تھے۔ ان کا مقولہ تھا کہ یہ شیطانی علم ہے۔ لیکن اس کے باوجود میر نہال اور ان کے ہم نشینوں کو یہ خوش اعتقادی تھی کہ کمبل شاہ کیمیا کا راز بخوبی جانتے ہیں اور اس خوش اعتقادی کی وجہ صرف اتنی سی تھی کہ ایک بار باتوں ہی باتوں میں انھوں نے میر نہال سے کہیں اتنا کہہ دیا تھا کہ میر صاحب میں اس علم سے واقف ضرور ہوں لیکن میں نے قسم کھائی ہے کہ ہرگز کسی کو اس کا راز نہ بتاؤں گا۔ پھر بھی میر نہال سے ان کے دوستانہ اور کیمیا کے ذریعے مقربین یہ [illegible] رہتے تھے کہ دیکھ لینا کسی دن کمبل شاہ موج میں آ گئے تو آپ کو سب کچھ سکھا دیں گے۔ آپ پر ان کی خاص نظرِ کرم ہے آپ ان کی خدمت میں کوئی کوتاہی نہ کیجیے گا۔ اور وہ سب اس مبارک ساعت کی آمد کے منتظر رہنے لگے کیونکہ یہ علم ایسے ہی اللہ والوں فقیروں، بھکشوؤں اور جوگیوں کے پاس ہوتا ہے......

کمبل شاہ بیٹھے ہوئے اپنے کمبل میں ایک کترن کا پیوند لگانے لگے۔ ذرا ذری ہر بات چیت کا سلسلہ بدستور قائم رہا۔ لال شاہ سنانے لگے،

"ایک دفعہ قبلہ والد صاحب کو ایک جوگی نے اکسیر دی تھی جس کی ایک سینخ لگاتے ہی تانبا خالص کندن بن جاتا تھا۔"

کمبل شاہ اس پر بولے:

"ہاں اس میں بھی مشیتِ ایزدی کا اسرار پوشیدہ ہے طرح طرح سے وہ اپنے جلوے دکھاتا ہے۔ وہ اپنا اظہار کرتا ہے اور ہم پہچاننے سے قاصر رہتے ہیں بندوں کو چاہیے کہ اس کے رازوں کو جاننے کی کوشش نہ کریں بلکہ اپنے وجود کی حقیقت اور اسرار ڈھونڈیں۔ اگر ہر شخص کیمیا بنانے لگے تو امیر و غریب کا امتیاز اٹھ جائے گا اور انسان اپنے غرور و تکبر میں خدا سے بے بہرہ ہو جائیں گے۔

اتنا کہہ کر انھوں نے اپنا ڈنڈا سنبھالا اور چل دیئے۔ تھوڑی دیر تک میر سنگی، مولوی دلہن اور لال شاہ ششدر اور کھوئے کھوئے بیٹھے رہے۔ پھر ایک ایک کر کے وہ بھی رخصت ہو گئے۔

برسات کا موسم تھا سورج ڈھل رہا تھا کالی کالی گھٹاؤں کے پس منظر میں سورج کی سرخ، نارنجی اور سنہری روشنی پُرسکون بادلوں کے ٹکڑوں پر پڑ کر دلفریب نقش ونگار بنا رہی تھی اور نگاہوں کے سامنے بے شمار سنہرے سنہرے زرّیں خزانے بکھرے ہوئے تھے جنہیں دیکھ کر ذہن ایک ایسی سرمستی سے سرشار اور روح ایک ایسی سرخوشی سے بھرپور تھی جو نادیدہ اور اچھوتی ہے۔ اور میر نہال دوڑتی ہوئی اودی اودی بدلیوں اور ان کے شہابی کناروں کو دیکھ دیکھ کر یہی سوچتے رہے کہ جو کچھ کمبل شاہ کہہ رہے تھے شاید صحیح ہو۔ ان کے ماموں نے بھی اس لوہار سے یہی کہا تھا کہ کبھی حرص وہوا کے دام میں نہ گھِر جانا۔ بقول لوہار کے ان کے ماموں کا خود یہ چلن تھا کہ جب پیٹ پر پتھر بندھنے کی نوبت آجاتی اور کہیں سے بھی کھیل کا دانا اڑ کر منہ میں نہ آتا تو مجبوراً سونا بنا لیا کرتے تھے! اور اس کو بیچ کر جو دام آتے وہ غریبوں اور یتیموں اور فقراء کے کھانے پینے پر خرچ کر دیا کرتے اور محض آٹے میں نمک کے برابر اپنے طعام اور خوردنی پر صرف کرتے۔

یہ واقعہ جب میر نہال نے اپنے دوست احباب کو سنایا تو انھوں نے یہی کہا: "افسوس میر صاحب، بڑی ہی حماقت کی۔ زندگی میں ایسی ساعتیں بار بار تھوڑی ہی آتی ہیں۔ اپنے ہی ہاتھوں سنہری موقع گنوا دیا!" ان سب کی باتوں کا یہ اثر ہوا کہ آخر کار میر نہال کو خود بھی کیمیا میں دلچسپی پیدا ہو گئی، اور وہ نسخے کی تلاش میں دوبارہ راجپوتانے گئے بھی۔ لیکن لوہار مر چکا تھا اور یہ سفر بے سود رہا۔

اس کے بعد تو وہ کیمیا کے درپے ہو گئے اور اس کے راز کی ٹوہ میں عجیب و

غریب ہستیوں سے ملتے رہے سینکڑوں تجربے کیے، دھات اور پتھر طرح طرح سے پھونکے، لیکن ہر بار کچھ نہ کچھ کمی بیشی رہ جاتی تھی۔ کبھی تو وہ زیادہ پھُنک جاتا تھا اور کبھی ایک آنچ کی کسر باقی رہ جاتی تھی، سینکڑوں جوگی فقیر، ہزاروں ولی اللہ آئے اور گئے مگر نہ تو کسی نے ان کو کچھ سُن گن دی نہ صحیح ترکیب ہاتھ آئی۔ کوئی کہتا پارہ کا کشتہ ابابیل کے گھونسلے کی مٹی اور بیٹ سے پھونکنا چاہیے، کوئی کہتا اسے لومڑی کے خون میں حل کرنا ضروری ہے یا شیر کی چربی میں لپیٹ کر تو ے اُپلوں کی آنچ میں پھونکنا۔ ہر ایک نئی ترکیب بتاتا اور سب سلیمانی قصّے سنا کر ان کی جستجو کو اور بھڑکا دیتے، لیکن کوئی فقیر پتے کی بات نہ بتا سکا۔ کبھی کبھی کیمیا پھونکتے وقت میر نہال کو خیال آتا کہ اگر سونا بن گیا تو معجزہ ہوگا۔ مگر ایسے بھی فقیر تھے جو کہتے تھے یہ معجزہ نہیں ہے، بالکل سچ ہے ہم نے اپنی آنکھوں سے خود سونا بنتے دیکھا ہے۔ لیکن میر صاحب کے لیے یہ اعجاز ہی رہا۔ نہ تو کسی نے بنا کر دکھایا نہ وہ بُوٹی فراہم کی جس سے میر نہال خود سونا بنا لینے میں کامیاب ہوجاتے۔ مگر پے در پے شکستوں کے باوجود بھی وہ ایک ناکامیاب تجربے کے بعد دوسرا تجربہ بڑے تحمل و استقلال اور امید سے کرتے چلے گئے۔ اور یہ امر مُسلّم ہے کہ اگر اِس جہاں میں اُمید نہ ہوتی تو انسان خودکشی کر لیتا اور یہ دنیا ایک ایسے بنجر و ویران ریگستان کے مصداق ہوجاتی جہاں پر کہیں کوئی نخلستان نہ ہو۔ پیچ در پیچ فریب کار راہِ حیات پر چلنے والا انسان ہر آنے والے موڑ پر یہی سمجھتا ہے کہ اس موڑ کے بعد اس کی منزل ہوگی اور جب موڑ پر پہونچ جاتا ہے تو وہاں معدومیٔ منزل اور ایک ناکامی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن پھر وہ اپنے دل کو ڈھارس دے کر چل نکلتا ہے اور راستہ اس امید میں طے کرتا جاتا ہے کہ اگلا مقام اس کی منتہائے منزل ہوگا۔ یہ سلسلہ ہائے گردش یوں ہی چلتے رہتے ہیں۔ انسان ہر ہر مقام پر دھوکا کھاتا ہے۔ ہر ہر گام پر نامُرادی حاصل ہوتی ہے لیکن

اس کے باوجود حوصلے ٹوٹ ٹوٹ کر از سرِ نو بنتے ہیں۔ اسی کا نام امید ہے جو نفس بہ نفس قدم بہ قدم انسان کے ساتھ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔ اور میر نہال بھی حقیقتوں پر سراب و وہم کا نقاب ڈالے ہوئے جی رہے تھے۔ ماہ و سال اسی طرح گزرتے رہے۔ زندگی اسی طرح اپنے محور پر گھومتی رہی جیسے وہ قدیم الایام سے دنیا کی سلطنت پر حکومت کرتی رہی ہے۔

٦
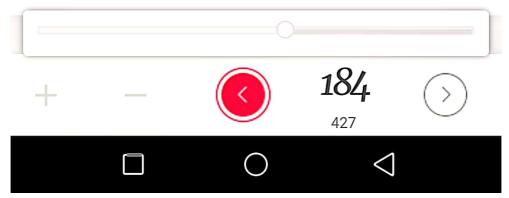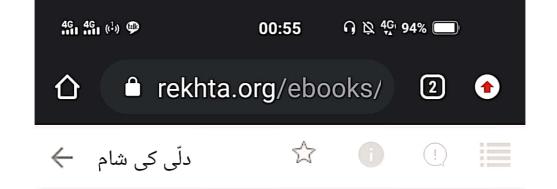
پھر رمضان آ گئے۔ لوگ روزے رکھنے لگے۔ گرمی میں خالی پیٹ لمبا دن گزارنا قیامت معلوم ہوتا مگر دو چار روزوں کے بعد بارشیں شروع ہو گئیں اور روزے سہل ہو گئے۔ سحری کے وقت گداگر چیخ چیخ کر سر سونے والے کو جگا دیتے۔ اشعار گاتے، کنڈیاں کھٹکھٹاتے، رمضان المبارک کے فضائل بیان کرتے، روزہ داروں کو فردوس النعیم کی خوش خبریاں سناتے اور خوابِ غفلت میں رہنے والوں کو روزِ محشر کا خوف دلاتے۔ دو بجے جامع مسجد پر نقارہ بجنے لگتا اور لوگ بیدار ہو کر دودھ میں بھیگی ہوئی پھینیاں اور کھجلے کھاتے۔ مامائیں اٹھ کر تازے تازے پراٹھے پکاتیں اور قیمہ گرم ہونے کی خوشبو آتی۔ بچے بھی اٹھ کر بڑوں کے ساتھ سحری کھانے میں شریک ہو جاتے۔ اور سحری ختم کرتے کرتے نثار احمد فجر کی اذان کہتے۔ گولہ دن سے چل کر سحری ختم ہو جانے کا اعلان کرتا۔ لوگ وضو سے فارغ ہو کر خشوع و خضوع کے ساتھ نماز پڑھتے اور کلام مجید کی تلاوت میں مشغول ہو جاتے۔

دن کو فقیروں کا تانتا بندھا رہتا۔ ایک جاتا دوسرا آتا۔ کوئی ٹولیوں میں

آتے۔ کوئی سارنگی یا اک تارا بجاتا۔ کسی کو نعتیں یاد تھیں کسی کو غزلیں۔ پیشہ ور فقیر اور زیادہ دل دوز صدائیں لگاتے۔ بھیک ملنے سے پہلے ہی مائی کی خیر مناتے۔ بال بچّوں اور ولی وارثوں کو دعائیں دیتے۔ میر نہال اور ان کی بیوی مسرور کے ہاتھ پیسہ دو پیسے بھجوا دیتے یا دلچین تڑاتی ہوئی دروازے پر جاتی اور پیالہ بھر آٹا یا بچی کھچی روٹی ان کے کشکولوں میں ڈال آتی۔ دونوں وقت ملتے ہی فقیروں کی تعداد میں اضافہ ہوجاتا کیونکہ روزہ کھولنے کے وقت افطاری کی تیاری ہوتی اور ان فقیروں کی جھولیاں مزے دار چیزوں سے بھر جاتیں۔ ایسے فقرا کا رمضان میں کاروبار زیادہ چمکتا۔ خوب پھلتے پھولتے اور آنندگی بین بجاتے۔ تنگ دستی کے بجائے ان کی انٹیاں اتنی گرم ہو جاتیں کہ اپنے گھروں کو بال بچّوں کے نام روپیے بذریعہ ڈاک روانہ کرتے۔

اگرچہ ان گداگروں میں بڑی خامیاں تھیں مگر وقت کے وہ سب پابند تھے اور اپنے مقررہ وقت کے علاوہ کبھی پھیری نہ لگاتے۔ اس لیے ان کا آنا لوگوں کو شاید بار بھی گزرتا تھا، بلکہ لوگ ان کی آوازوں سے مانوس اور ان کی صداؤں کے اتنے عادی ہوگئے تھے کہ اگر کبھی کوئی مانگنے والا معمول کے مطابق نہ آتا تو سب کو اس کے نہ آنے کی چینتک ہو جاتی۔ ایک تھے جو ٹھیک رات کے کھانے کے وقت آیا کرتے تھے۔ ادھر دستر خوان بچھا ادھر انھوں نے دروازے پر صدا لگائی اور جس دن وہ نہ آتے بیگم نہال بار بار کہتیں:

"ہے ہے نہ جانے بچارے سائیں پر کیا بپتا پڑی۔ کہیں بیمار تو نہیں پڑ گیا۔ نگوڑا آج نہیں آیا۔"

کچھ ایسے بھی تھے جو مختلف وقتوں پر آتے جاتے رہتے تھے۔ ان میں سے ایک لوہن شاہ تھے جن کے ہاتھوں میں لوہے کے موٹے کڑے اور چوڑیاں ہوتیں پاؤں

ہیں سیروں وزنی لوہے کی بیڑیاں اور بھاری بھاری لوہے کی زنجیریں گلے کا ہار ہوتیں۔ کوئی بیس سیر لوہا ان کے تن بدن پر ہوتا۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ بچپن میں کسی کامل کے مرید ہو گئے تھے جن کا حکم تھا کہ لوہا پہنا کرنا۔ وہ دن اور آج کا دن وہ پیر کا حکم حرف بہ حرف پورا کر رہے تھے۔ لمبے تڑنگے تاڑ کے تاڑ تھے۔ کسرت کا شوق تھا اور بھنگ گھوٹنے کی لت۔ دنیا میں بس ان کا ایک ہی یار تھا اور وہ ان کی بکری۔ اپنے مالک کی طرح وہ بھی موٹی تازی تھی اور بڑے ٹھسے سے اُن کے ساتھ قدم بہ قدم چلا کرتی۔ سدھی بھی خوب گئی تھی۔ یہ جہاں ٹھہرتے وہ بھی رک کر کھڑی ہو جاتی۔ ان کی نہ کوئی صدا تھی نہ مانگنے کی کوئی ادا۔ بس نور نامہ جس میں ساتوں افلاک کا ذکر ہے پڑھا کرتے۔ لوحدار آواز میں بلا کی کشش تھی اور طرز میں سوز و گداز جو سونے پر سہاگے کا کام کرتی۔ ان کی آواز جوں جوں قریب ہوتی جاتی اس کی گونج میں تیزی آتی جاتی۔ دور سے ان کی آواز سنائی دیتی:

سو ہے آسماں پانچواں خاص سیم
چھٹا لعل یاقوت سے ہے نئیم
جو ہے آسماں ساتواں جانچ کا
ہے یک رنگ سارا ہیری کلنچ کا

اُن کا پھیرا رات کو دس بجے کے بعد مقرر تھا، اور اُن کے چلے جانے کے بعد بڑی دیر تک فضا میں گونج سنائی دیتی رہتی اور دنیا اور بھی سونی معلوم ہوتی“.....

سائلوں کی ایک وہ بھی قسم تھی جو سال میں عید بقرعید یا کسی ایسے تیج تہوار اور عرس کے موقعوں پر مختلف مہینوں میں آتے رہتے۔ برس میں ایک بار آئے، چکر لگایا جو نصیبے کا ہوا بٹورا اور رفو چکر ہو گئے۔ پھر ان کی صورت اگلے سال ہی نظر آتی۔ زیادہ تر وہ گنوار اور دیہاتی ہوتے تھے جو فصل کٹنے کے بعد

زمین جوتنے سے پہلے شہر کا رُخ کرتے تھے۔ وہ یا تو ضرب کاری کرنے کے خیال سے یا جمع جکڑا ختم ہو جانے پر ہی پر آتے تھے۔

اس گروہ کے ایک شاہ مقبول تھے جو رمضان شروع ہوتے ہی آن ٹپکتے اور عید کی ٹرمنانے کے بعد غائب ہو جاتے۔ ان کا یہ قاعدہ تھا کہ سویرے سویرے اپنی پھیری شروع کرتے اور اپنی من گھڑت صدا لگاتے جو نہ گیت معلوم ہوتی اور نہ اس میں نظم کا اتار چڑھاؤ ہی ہوتا:

آئے شاہ مقبول
ایک لیں گے پیسہ اور گز بھر لیں گے لٹّھ
آج دے کل دے
عید کے روز مقبول شاہ کا سوال پورا کر دے

وہ کسی ڈیوڑھی یا دروازے پر کبھی نہ ٹھہرتے، آواز لگاتے ہوئے گزر جاتے۔ جب تک کوئی بندۂ خدا خود ہی بڑھ کر نہ روک لیتا وہ ہرگز نہ رکتے۔ ایک پیسہ اور گز بھر لٹّھ کے علاوہ کچھ اور لینا ان کو قسم تھا۔ اگر کسی نے آٹا یا روٹی پیش کی تو صاف انکار کر دیتے۔ ان کی اس کج اطواری میں بھی ایک وقار تھا اور ان کی شخصیت جھلکتی تھی۔

مقبول شاہ کی آمد جہاں بچّوں کے لیے پیامِ عید ہوتی وہاں بڑوں کے واسطے بھی مژدۂ خوشی۔ ان کے آنے کے بعد سے تو کیا بچّے کیا بوڑھے سب کو عید کا رَٹ انتظار رہنے لگتا۔ اب عید قریب آگئی تھی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اصغر کی شادی بھی دُور نہ تھی۔ شادی کی تاریخ پہلے تو عید کے چاند ہی قرار پائی تھی لیکن میر نہال کے بڑے بیٹوں کو جو سرکاری ملازمت میں تھے طویل رخصت نہ مل سکی کیونکہ شہنشاہ جارج پنجم کی تاجپوشی کے انتظامات ملک کے افسران کے سپرد کر دیے گئے تھے۔ لہٰذا کسی افسر کو چھٹی نہ مل سکتی تھی اور ان کا عملہ بھی اس کی تیاریوں میں

لگا ہوا تھا۔ اس واسطے شادی کی تاریخ آگے بڑھادی گئی اور بات دسمبر پر جا پڑی۔ دسمبر ہی میں جشن بھی ہونے والا تھا۔

بہر نوع میر نہال کے گھر میں اصغر کی شادی کی تیاریاں تو چپکے چپکے مدّتوں پہلے سے ہو رہی تھیں۔ اب گھر کے ہر فرد کے ذمہ کوئی نہ کوئی چھوٹا بڑا کام سونپ دیا گیا۔ مسرور بازار سے گوٹا کناری ٹھپّا لا لا کر دکھاتا یا بزّازوں کے ہاں سے تار بافتے، بنارسی اور کمخواب کے تھان لا کر پسند کرواتا۔ سعید حسن زیور بنوانے میں سادے کاروں اور سناروں سے نبٹتے۔ انجم زمانی کے ہاتھ میں سوئی شپا شپ چلتی نظر آتی اور وہ چڑھاوے کے جوڑے کھڑے کرنے یا چمپا پیمک ٹانکنے میں مصروف رہتیں۔ جمال بیگم کی عمر خاصی تھی۔ اُٹھک بیٹھک کے کام تو ان کے بس کے نہ تھے، ایک جگہ دھیّا دے کر گوٹے کے واسطے کھوپرا اور چھالیہ سیروں کے حساب سے کتر ڈالتیں اور خربوزے کے بیج چھیل کر رنگ دیتیں اور پھر بیٹھی بیٹھی ہدایتیں کرتیں اور نصیحتوں کے پشتارے کھل جاتے:۔

"مہرو، اے مہرو، چل تو آ کر ادھر بیٹھ کل کو پرائے گھر جانا ہے۔ ذرا تو دیدہ ٹیکا۔ کل سے جو دو پٹہ سے ہاتھ اٹھایا ہے دھرا ہی نہیں مسل وسل کر اب ختم کر دیجو پھر بیل لگائیو۔ توبہ ہے آج کل کی لڑکیاں بن سری گھوڑیاں ہو گئی ہیں۔ سینے پرونے میں جی لگتا ہی نہیں۔ اے میری بات سات برس کی عمر میں ہی پکی ہو گئی تھی۔ بُوا جب سے اللہ بخشے اماں اور نانی کچوکے دیتی تھیں۔ مجال تھی کہ جگہ سے ہل تو جائیں۔ مہرو کی طرح تھوڑی کہ یا تو بڑی ستایا کریں یا ہُدڑ ہُدڑ پھرا کریں......"

بیگم نہال نے اپنی دونوں بڑی بہوؤں کو پہلے ہی سے بلوا بھیجا تھا کہ ذرا ہاتھ بٹ جائے۔ بڑی دلہن کی تو کچی پال اتنی ڈھیر ساری تھی کہ ان کا پائنچہ بھاری تھا، بھلا اتنی جلدی کیسے آ جاتیں البتہ منجھلی دلہن اپنے تین برس کے بچے کو لے کر پہنچ گئیں۔ ان کے ساتھ ان کی اماں بھی تھیں۔ بیگم نہال سے ان کا دوہرا تیہرا رشتہ تھا۔ بھاوج بھی تھیں،

سمدھن بھی اور پھوپی زاد بہن بھی۔ ادھر بھوپال سے وحیدہ بیگم معہ اصغر کے آ پہونچیں۔ سب کے آجانے سے بہار سی آ گئی اور ایسی چہل پہل ہوئی کہ میر نہال کا گھر تقریب سے مہینوں پہلے ہی شادی کا گھر معلوم ہونے لگا۔ ہر ایک خوش خوش نظر آتا تھا۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

ان ہی ہنگاموں میں عید بھی قریب آ گئی۔ بچے اِٹھلا اِٹھلا کر پھرتے۔ ہر ایک کو عید کے لیے نئے کپڑے پہننے کی جلدی تھی۔ اپنی فرمائشیں کر کر کے ماؤں کا دم ضیق میں کر رکھا تھا۔ کوئی کہتا میری نئی لال ٹوپی آ گئی؟ ایک کا تقاضا ہوتا میں نئی جوتی پہنوں گا۔ دوسری بچی مچلتی میں ابھی چوڑیاں پہنوں گی۔ کسی کو اوڑھنی کسی کو مہندی چاہیے تھی۔ غرض ہر بچہ اپنی اپنی دھن میں تھا۔ کپڑوں کے شوق اور عید کے انتظار نے بچوں کو زیادہ چُلبلا کر دیا تھا۔ رات کو بھی وہ ان خیالوں کی وجہ سے غافل نہ سوتے تھے اور پھر دن کو چڑچڑاتے رہتے اور ان سب کو قابو میں رکھنا گرہ اور ہنرمندی کا کام تھا۔

شادی کی تیاری دیکھ دیکھ کر اصغر بھی چونچال تھا اور اندر سے باہر تک ایک پیر سے دوڑ دوڑ کر پھیرے لگاتا اور اُسے اپنی ذات بڑی اہم اور ضروری معلوم ہوتی۔ اپنی تنخواہ میں سے بچا کر ہزار روپیے جوڑے تھے جو اُس نے باپ کو لے جا کر پیش کیے۔ اُسے پہلی بار دیکھ کر تو میر نہال غیر شعوری طور پر بکھر گئے تھے، لیکن اصغر کی اس سعادتمندی سے دل پسیج گیا اور انھوں نے آج سے اس کو معاف کر دیا۔

آخری روزے کے دن سب نے سر شام ہی سے چھت پہ جا جا کر عید کا چاند گھوُر گھوُر کر دیکھنا شروع کر دیا لیکن آسمان پر ابر چھایا ہوا تھا اور چاند نظر نہ آیا۔ رات کے کھانے کے بعد توپیں سر ہوئیں اور اس کے ساتھ ہی سب کے چہرے خوشی سے دمک اُٹھے۔ ہر طرف عید کی مبارک سلامت کا غلغلہ ہوا اور رات صبح کی تیاریوں میں گزر گئی۔ بچیاں چوڑیاں پہن اور مہندی ہاتھ پاؤں میں رچا کر بیٹھ گئیں۔

عین عید کی صبح میر نہال کے منجھلے بیٹے حبیب الدین بھی آ گئے۔ یہ نہ صرف والدین کے چہیتے تھے بلکہ پورے خاندان میں ہر دل عزیز۔ چھوٹے بڑے آئے گئے، سب ان کے گرویدہ تھے۔ ان کے آنے کا سنتے ہی سارے کنبے والے اور رشتہ دار شہد کی مکھیوں کی طرح آ کر ان کے گرد جمع ہو گئے۔ ان کی شکل و شباہت باپ سے ملتی جلتی تھی۔ بیضوی ڈاڑھی سے اور وجیہہ اور باوقار نظر آتے تھے۔ آنکھوں کی نرمی میں ذہانت تھی جو ان کی رحمدلی اور روح کی پاکیزگی کی ترجمانی کرتی تھی۔ دوستی کے معاملے میں وفا اور ایثار کے پتلے تھے۔ یہ ان کی عالی ظرفی اور وضعداری تھی، جس نے اپنے پرائے کا دل جیت لیا تھا۔ اپنی زندگی کا اصول انھوں نے سعدی کے ان اشعار پر مبنی کر لیا تھا:

کارسازِ ما بہ فکرِ کارِ ما
فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

اور اس نظریہ حیات نے ان کی زندگی بہت خوش گوار بلکہ مہر و الفت کی چاشنی سے پُر کر دی تھی۔

عید کی صبح کو چار بجے ہی سے گھر کے لوگ اُٹھ کر نہانے دھونے میں مصروف ہو گئے تھے۔ دیگچیں باورچی خانے میں جلدی جلدی شیر خرما پکا رہی تھی۔ دن نکلتے ہی عیدگاہ جانے کی مارا مار ہو گئی۔

بیٹوں پوتوں اور نواسوں کے جھرمٹ میں میر نہال کھِلے پڑتے تھے۔ آج ان کے صافے کی کساوٹ میں وہ نفاست اور اہتمام تھا کہ اس کے پیچ میں ان کے ابرو کا ذرا سا حصّہ بھی چھپ گیا تھا۔ ان کی ڈاڑھی ہمیشہ کی طرح بنی سنوری شاہانہ انداز میں اوپر چڑھی ہوئی تھی۔ وہ جامہ زیب تو تھے ہی اور اس عمر میں بھی ان میں غضب کی پھبن تھی۔ بچّے ان کو جب گھیر کر کھڑے ہو جاتے تو فرطِ انبساط سے ان کے گلّوں کی جلد پھڑکنے لگتی اور آنکھوں میں مسرت کی چمک آ جاتی۔

عفور نے سب کو سلام کیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ عید کی خوشی میں تیل کی پوری کپّی اس نے سر میں اُنڈیل لی ہے۔ الغاروں تیل کنپٹیوں تک بہہ رہا تھا اور گُدّی سے بہتا ہوا اچکن کے کالر تک آ گیا تھا، اور اس پر چکیٹا ڈال دیا تھا۔ اس نے حبیب الدین کے بیٹے کو گود میں اٹھا لیا اور سب مل کر نماز پڑھنے چلے۔

عیدگاہ میں آدمی پر آدمی ٹوٹا پڑتا تھا۔ راستوں پر تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ دلّی والے تو دلّی والے، بلّب گڑھ اور قطب مہرولی سے بھی دُھنیے، جولاہے، کسان، کھٹ بنے جمعۃ الوداع ہی سے عید منانے پورے پورے کُنبے لے کر آ گئے تھے۔ ان کی عورتوں کے لہریے دار لوگڑے، ان کے پیجامے اور ڈھیلے ڈھالے کرتوں کے گہرے بسنتی، عبّاسی اور فیروزی رنگ دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ عید کے ہمراہ پھاگن کی رُت بھی رنگا رنگ پھول کھلاتی آ گئی ہے۔

باپ بھائیوں کے کندھوں پر ہنستے کھیلتے بچّے سوار تھے۔ لواسوں پوتوں کی انگلیاں پکڑے ہوئے نانا دادا خوشی سے عیدگاہ کی طرف جا رہے تھے۔ لوگوں کی باتوں کا غلغپاڑا، چیزیں بیچنے والوں کی صدائیں، کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ سڑکوں، پٹریوں اور میدانوں میں سودے والوں کا اژدھام عیدگاہ تک چلا گیا تھا۔ ہر طرف کھلونے والے نظر آتے تھے۔ وہ کونسی دنیا جہاں کی چیز تھی جو ان کھلونوں میں نہ تھی، مٹّی کے جانور، گھرداری کا سامان، گڑیا کا جہیز، ایک مٹّی کی سبزی پھل پھلواری لیے بیٹھا ہے تو ایک کے پاس چھپر کھٹ، مسہریاں، پالکی نالکی ہوادار ہیں۔ ایک بیچ راستے میں جھانجھ بجاتی گڑیا دکھا رہا ہے اور ساتھ ساتھ کہتا بھی جا رہا ہے: "تنتو بجے با ہو گا، ادھی کی دال میں کیا ہو گا۔" دوسرا ابوے اور چینی کی گڑیا دکھا کر بچّوں کا من للچا رہا ہے۔ اور بچّوں کا یہ حال کہ کوئی تار کی سارنگی پہ روں روں کر رہا ہے تو کوئی تاشے باجے والی گاڑی کھڑ کھڑ کرتا لیے جا رہا ہے، کوئی

ابا کی گود میں مچل مچل کر کاغذ کی گنبد اور طوطے کے واسطے رو رو کر زمین و آسمان سر پر اٹھائے ہوئے ہے۔

آدمیوں کا ریلا دھکم پیل کرتا ہوا چلا آرہا تھا۔ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ میر نہال اور حبیب الدین بھیڑ بھڑکا چیر کر بڑی مشکل سے راستہ بناتے ہوئے جب عیدگاہ پہنچے تو جماعت کی تیاری کے گولے چھوٹ رہے تھے اور صفیں کھڑی ہونی شروع ہو گئی تھیں۔ اور جیسے ہی تکبیر کی آواز آئی اچانک وہ شور اور غلغلہ بند ہو گیا۔ زمین و آسمان دم بخود ہو گئے۔ ہر چیز پر سکوت طاری ہو گیا اور ہر شخص سرنگوں اور فضا اتنی خاموش ہو گئی کہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی زندہ آدمی موجود نہیں ہے۔ یک لخطہ مکبّروں کی تکبیر کہنے کی آواز صفوں کو عبور کرتی ہوئی رکوع و سجود میں دور دور تک آتی اور پھر وہی خاموشی چھا جاتی اور سوائے محبتِ الٰہی سے دھڑکتے ہوئے دلوں کی دھک دھک کے کوئی آواز نہ ہوتی۔ کبھی کبھار کسی بچے کے رونے کی آواز یکبارگی ابھرتی جو اتنے عظیم مجمع میں یکہ و تنہا رہ جانے کے خوف سے رو دیتا، یا پھر کہیں کوئی گھوڑا ہنہناتا یا کوئی چیل زور سے چلچلاتی ہوئی آسمان پر منڈلا کر فضا کے سکوت کو برباد کر دیتی۔

نماز ختم ہوتے ہی دوست احباب محبت اور گرم جوشی سے گلے ملنے لگے۔ برس کے برس دن عاشقوں کی تمنا بر آئی اور اپنے محبوبوں کو سینے سے چمٹانے لگے۔ رسمِ دنیا بھی تھی اور عید کا دن بھی۔ میر نہال کا خاندان بھی عید ملنے کے بعد ایک طرف کھڑے ہو کر بھیڑ چھٹنے کا انتظار کرنے لگا۔ پھر میر نہال نے خستہ کچوریاں، سینخ کے کباب، قطبی پراٹھے اور مٹھائی خریدی۔ حبیب الدین بچوں کی انگلیاں پکڑے ان کی پسند کے کھلونے دلوا رہے تھے۔

گھر پہونچ کر چھوٹوں نے بڑوں کو سلام کیا اور بڑوں نے عیدی دے دیکر

گلے لگایا۔ حد تو یہ ہے کہ آج کے دن جمال بیگم نے بھی سب بچوں کو دو دو آنے دیئے۔ عیدیاں وصول کرتے بچوں کو ایک لمحہ خالی نہ ملتا تھا کہ وہ اپنی خوشی پر خوش ہو سکیں۔ عید کا دن تھا اور فرحت و راحت کا دَور دورہ۔ کائنات کا ذرّہ ذرّہ ہنس رہا تھا۔

مرد رشتہ داروں سے ملنے چلے گئے اور بیویاں مہمان داری میں لگ گئیں۔ بیگم نہال کو تو آج دم لینے کی فرصت نہ ملی۔ سقّہ، دھوبی حلال خوری، محلّے والیاں سب ہی عیدی کے منتظر سلام کرنے کھڑے تھے۔ اصغر کی سسرال میں حصہ اور بلقیس کے واسطے عیدی بھیجدی گئی تھی۔ حصّے آرہے تھے اور جارہے تھے۔

حبیب الدین واپس آئے تو مسرور پتنگ اُڑا رہا تھا۔ انھوں نے بھی پانچ روپیہ کا ڈور مانجھا اور پتنگ منگوا کر اصغر کو دیں۔ وہ ایک جرخی سے کم پینچ لڑانے کا قائل نہ تھا۔ پتنگ جتنی دور اور اونچی ہوتی اتنا ہی اس کو مزا آتا۔ اصغر نے کانپ ٹھڈا ٹھیک کیا اور پتنگ بڑھائی۔ حبیب الدین اور شمس بیٹھ کر پتنگ بازی کا تماشا دیکھنے لگے۔ اصغر کی پہلی گُڈّی نے بڑھتے ہی تو پینچ کاٹے۔ پھر اس نے گُڈّی کو اتار کر اس پہ "نوشیرواں" لکھا اور دوبارہ بڑھایا مگر اب کے وہ پہلے ہی پینچ میں کٹ گئی۔

ظہر کے وقت منوّر قلفی والا آگیا اور حبیب الدین نے گھر بھر کو ملائی کی برف کھلوائی۔ مرد بیٹھک میں شرط لگا لگا کر قلفیاں کھانے لگے اور بچّے عورتوں کو قلفیاں دینے زنان خانے میں دوڑ بھاگ کرتے رہے۔ تھوڑی ہی دیر میں منوّر کا سارا مٹکا خالی ہو گیا۔ اس نے مٹکے کو الٹ کر پانی گلی میں بہادیا۔ بچوں نے نمکین برف کے ٹکڑے اس سے مانگ کر لیے اور مزے لے لے کر نیت سیر ہو کر کھائے۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

دن ہوا کی طرح صر صر کر کے ہو گئے اور رم جھم کرتا ساون آ گیا۔ ساون من بھاون کہلاتا ہے۔ اپنے ساتھ جو بہار اور حسن لے کر آتا ہے وہ دِلّی کے دل والے ہی جانتے ہیں۔ جب کالے کالے بادل آتے ہیں اور گھنگھور گھٹائیں چھاتی ہیں، ارض و سما پر شباب آ جاتا ہے۔ ذرّہ ذرہ انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتا ہے۔ خوابیدہ کلیاں چپکے سے آنکھیں کھول دیتی ہیں، دھرتی مسکراتی ہے، ہوائیں گنگناتی ہیں، جل تھل بھر کر ندی نالے دھوم مچاتے ہیں۔ کاجل کی طرح کالی کالی ساون کی بھیگی راتوں میں جب تھم تھم کر بادل گرجتے ہیں تو ایک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے۔ پپیہے کی پی ہو پی ہو تڑپ اور بڑھاتی ہے۔ بچھڑے ساجن یاد آتے ہیں۔ سہاگنیں اور کنواریاں برہا کے گیت گا گا کر اپنے شوقِ وصل کی داستانیں کہتی ہیں اور محلّوں میں ملہار گائے جانے کی آوازیں، بوندوں کی چھما چھم کے ساتھ آنے لگتی ہیں:

سکھی آون آون کہہ گئے
آئے نہ بارہ ماس......

لوگ برسات منانے قطب اور ہمایوں کی مقبرے کی سیر کو نکل جاتے۔ ہر طرف ہریالی تھی۔ درختوں کے تنوں سے خودرو بیلیں لپٹ کر لہلہا رہی تھیں۔ نظام الدین اور مہرولی کے جنگلوں میں منگل ہو گیا تھا، جن میں مور دَمکتی ہوئی دُموں کا چھتر پھیلائے ناچ رہے تھے۔ نیم اور شیشم کے درختوں پر بندر اِدھر سے اُدھر چھلانگیں مارتے لوٹتے۔ کنجوں میں شامائیں اور ڈومنیاں پھدک پھدک کر چہچہاتیں۔

ساون کی جھڑی لگتے ہی گلی اور کوچوں میں پانی کھڑا ہو گیا۔ چھتیں ٹپکنے لگیں اور شہر کی عمارتوں میں سیل اتر آئی۔ ہر طرف نمی اور سیلن ہو گئی۔ جگہ جگہ سے دیواریں کائی سے سبز ہو گئیں۔ رات کو اکثر موسلا دھار بارش ہوتی۔ پرنالے دھائیں دھائیں

01:01 94%

rekhta.org/ebooks/

دلّی کی شام

کر کے شور کرتے۔ رہ رہ کر بجلی چمکتی اور زور کا کڑاکا ہوتا۔ جب مینہ تھم جاتا، تو اولتیاں ٹپ ٹپ گرتیں، مینڈک ٹرّاتے اور دیواروں کے کسی سوراخ میں ایک جھینگر کی جھنکار، دور بجتے ہوئے مجیروں کی طرح سنائی دیتی۔ مہندی کا درخت جو گرمی سے مرجھا کر ٹنج منج ہو گیا تھا ہرا بھرا ہو کر پھولوں سے لد گیا اور اس کی پتیوں پر بارش کی بوندیں موتی کی طرح ٹکی رہتیں اور حنا کے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سارے گھر میں پھیلی رہتی۔ آموں پر کوئلیں کوکتی رہتیں اور ہر طرف ساون کے دردانگیز گیت سنائی دیتے:

چھا رہی کالی گھٹا جیا را مورا لہرائے ہے

آم پر کیوں جم رہا ہے اے پپیہا آ اِدھر
تو سراپا درد ہے میں بھی تو دلسی زرد ہوں

فرق اتنا ہے کہ تجھ میں رس ہے تجھ میں ہائے ہے
چھا رہی کالی گھٹا جیا را مورا گھبرائے ہے

اور ہجر و فراق کے پس منظر میں اودی اودی بدلیوں کی طرح اصغر کی شادی کی تیاریاں آگے بڑھتی رہیں اور اصغر کی محبت کی امنگ بھی نکھر کے سبزے کی طرح لہلہانے لگی۔ وہ اکثر چھت پر لیٹ کے شام کی گلابی گلابی فضاؤں میں فیروزی، بادامی اور اودے بادلوں کا تماشا دیکھتا رہتا جو شفاف اور نکھرے ہوئے نیلے نیلے آسمان پر کسی خبطی مصوّر کی طرح ہر لحظہ ایک نئی صورت بناتے اور بگاڑتے رہتے۔ اور بادلوں کے نارنجی پہاڑوں پر کبھی آفتاب کی شعائیں جگمگا کر قوس و قزح کا حسین پُل بنا دیتیں اور زمین اور آسمان ایک دوسرے سے مل جاتے۔

ٗ ٗ ٗ ٗ ٗ

ساون بھادوں گھل گھل کر برسے اور برکھا رُت چلی گئی۔ جاتے جاتے اپنے ساتھ وہ حسین سماں بھی سمیٹ کر لے گئی۔ جاڑے شروع ہو گئے۔ دن چھوٹے اور راتیں لمبی ہو گئیں۔ آفتاب کا طنطنہ ختم ہوا اور دھوپ کی تیزی مٹ گئی۔ روئی بھرے دگلے، شلوکے اور فرغل نکل آئے۔ دن پلک مارتے ڈھل جاتا۔ پیلی پیلی دھوپ

196

427

Scanned by CamScanner

کوٹھوں اور چھجّوں پر ذرا کی ذرا ٹھہرتی اور شام دھواں دھواں ہو جاتی۔ دسترخوان بچھتا اور انگیٹھی پر تانبے کی رکابیاں گرم کرکے کھانا کھایا جاتا۔ ہر ایک انگیٹھی پر اپنی روٹی بار بار سینکتا۔ کھانے سے فراغت پاکر عورتیں چھوٹے بچوں کو گودوں میں لے کر اپنی رضائیوں میں دبکا لیتیں اور ان کے پھٹے ہوئے کلّوں پر موم روغن ملتیں۔ کانگڑیاں کلیجوں سے لگ جاتیں۔ ابا دان میں آگ سُلگا کر ہاتھ تاپے جاتے اور ساتھ ساتھ خوشی اور غم کی باتیں ہوتیں جس میں ماضی کے ملال، حال کا دکھڑا اور مستقبل کی امید اور اندیشے ہوتے۔ یا کبھی پہیلیاں بوجھی جاتیں اور بیت بازی کی بازی ہوتی۔ نہیں تو بچوں کے اصرار پر انجم زمانی پریوں اور جناتوں کے عجیب و غریب قصّے سناتیں۔ جب کسی کے پاس کچھ اور کہنے سننے اور کرنے کو نہ رہ جاتا تو سب ٹھنڈے برف بچھونوں میں گھس کر لحافوں میں دونوں ٹانگیں سکیڑ کر دبک جاتے۔

راتیں خاموش ہوتیں اور باہر جگر کے پار ہونے والی ہوائیں چلتیں۔ گلی کے نکّڑ کی کُپّی کے چاروں طرف روشنی کا پیلا ہالا قہقہہ بیں اور دھندلا پڑ جاتا۔ اس تیرگی و تنہائی میں اندھے فقیر کی دل دوز صدا آتی:

چند تہمت اپنے ذمّے دھر چلے
کس لیے آئے تھے ہم کیا کر چلے

اور سردیوں کی لمبی لمبی ویران راتیں اور پہاڑ معلوم ہوتیں۔

کبھی کبھی بہادر شاہ نامی فقیر رات کے سنّاٹے میں مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کی غزلیں گاتا ہوا آتا۔ وہ نہایت نحیف اور دھان پان تھا، اور اس کی ہیئت اس قدر حقیر کہ اسے دیکھ کر یہی معلوم ہوتا کہ کسی مردہ بلّی کے ڈھانچے پر مکھیوں کے غول کے غول بھنک رہے ہیں مگر اس کی ذات کتنی ہی بے معنی رہی ہو، اس کی آواز میں اس قدر سوز تھا کہ معلوم ہوتا تھا جیسے سارے جہاں کا درد کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔ جب وہ

Scanned by CamScanner
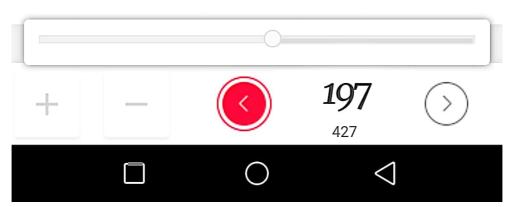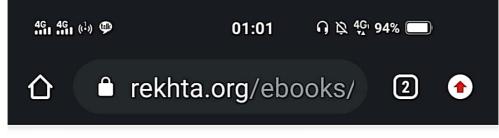
دلّی کی شام

ظفر کے اشعار گاتا تو عہدِ رفتہ کا وہ زرّیں دَور یاد دلادیتا جب دلّی موجودہ دردوالم سے واقف نہ تھی۔ اس فقیر کی آواز میں فقط شاہ ظفر کے ہی مصائب وآلام نہ سُنائی دیتے تھے بلکہ پورے ملک کی غلامی اور زبوں حالی کا شکوہ وفریاد بھی،

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں
کوئی میری قبر پہ آئے کیوں کوئی پھول چار چڑھائے کیوں
کوئی شب کو شمع جلائے کیوں میں تو بیکسی کا مزار ہوں
میں نہیں ہوں نغمۂ جاں فزا کوئی مجھ کو سُن کے کریگا کیا
میں بڑے بروگی کی ہوں صدا کسی دل جلے کی پکار ہوں .....

زندگی کی طرح وقت بھی گزرتے گزر گیا اور دسمبر آن پہونچا۔ دِلّی جو کبھی سُورما اور زورآور سلاطین کی راجدھانی تھی آج اس میں غیر ملکی فرنگی بادشاہ کی تاج پوشی کی دھوم تھی۔ اور سارے شہر میں ہل چل مچی ہوئی تھی۔ اہلِ دِلّی اس ہماہمی کے بیک وقت مشتاق بھی تھے اور مغموم بھی۔ انھیں حیرت بھی تھی اور نفرت بھی، وہ ہزاروں ابن الوقت جو غیروں کے خیر خواہ بن گئے تھے عہدوں کے لالچ اور اعزاز وخطاب کی آرزو میں خوش و خرّم تھے، لیکن لاکھوں وہ غیرت اور وفا کے بندے بھی تھے جنہیں اپنے وطن سے سچّی محبّت تھی۔ غیر قوم کی حکمرانی سے ان کے غیوّر دل مجروح اور سینے فگار تھے، جو اندر ہی اندر بے بسی اور غصّے سے پھُنک رہے تھے۔

198
427

۷

تاج پوشی سے کئی مہینے پہلے دِلّی میں چاروں کھونٹ سے آدمی آکر جمع ہوگئے تھے۔ قرب وجوار کے ملکوں سے بادشاہ وزیر اور ہندوستان کے نواب، راجا اور والیانِ ریاست سب ہی مدعو تھے۔ اور تاجپوشی سے دو تین دن پہلے تک بستی بستی قریے قریے سے لوگ اُمڈے چلے آرہے تھے۔ کرّوفر کا یہ عالم تھا کہ شہر بھر کی سڑکیں بلاناغہ دھوئی جاتیں، خاک دبانے کے لیے تیل کا چھڑکاؤ ہوتا اور شہر کا چپّہ چپّہ نہا دھو کر آئینہ کی طرح چمک اٹھا۔

کہانیوں میں اُڑن کھٹولے ضرور سنے تھے لیکن زمین پر اُڑتے پھرتے اُڑن کھٹولے دِلّی والوں نے آج تلک دیکھے نہ سُنے تھے۔ اور جب موٹر گاڑیاں فرفر کرتی اِدھر سے اُدھر زنّاٹے بھرا کرتیں تو ان کی عجوبہ بناوٹ اور ساخت کو دیکھ کر لوگوں کے منہ فرطِ حیرت سے کُھلے کے کُھلے رہ جاتے اور اس وقت اُن کو وہی کہانیوں کا مزا آتا۔ اس کے علاوہ جگہ جگہ عماریاں بندھے ہوئے ہاتھی گھم گھم کرتے اور دربار کے منتظمین گھوڑوں پر سوار شہر کا جائزہ لیتے پھرتے۔ ہر طرف غیر صورتیں اور اجنبی چہرے دکھائی

دیتے۔ چاندنی چوک اور چاوڑی بازار کے درو دیواران ناآشنا صورتوں کو خاموشی سے تکتے۔ دلّی کے کوچہ و بازار میں انوکھے لباسوں کے دامن سرسراتے۔ نئے نئے لوگوں کے کپڑے بھی نئی نئی وضع و قطع کے تھے۔ کہیں رنگ برنگ کی جاکٹیں اور صدریاں نگاہوں کو ورغلاتیں اور صدہا قسم کے کوٹ اور برجس، لکھوکھا قسم کی ٹوپیاں نئی تراش کے رنگ دکھاتیں۔ عام انگریز سیاہ اور گہرے نیلے سوٹ میں نظر آتے اور ٹامی بچے اپنی خاکی وردیوں میں سینے تانے لنڈتے پھرتے۔

لال قلعے کے پاس پشتے ہموار کردیے گئے اور شاہراہ سے لے کر پتھر والے کنویں تک دورویہ چبوترے اور جامعہ مسجد کے چاروں طرف بیٹھنے کے لیے لکڑی کی سیڑھی دار نشستیں تیار ہو چکی تھیں۔ اسی طرح موری دروازے سے فتحپوری تک چھتر دار چبوترے اور سائبان بنا دیے گئے تھے۔ فوّارہ پر ملکہ کے بت کے سامنے ایک عالی شان پشتے پر شامیانہ نصب کردیا گیا تھا۔ گھنٹا گھر کی سیم بندی کرکے کاغذی باغ سے اس کی بدنمائی چھپادی گئی۔

دلّی جو کبھی اپنے حسن میں یکتا اور ہندوستان کے تمام شہروں میں ممتاز و اعلیٰ تھی اس ساری جھوٹی سجاوٹ سے ایک تماشا گاہ بن کر رہ گئی تھی اور رات کو جب روشنیاں جلتیں تو نمایش کا دھوکہ ہوتا۔

قلبِ شہر میں نئی حکومت کی یہ نئی آن بان تھی اور میر نہال کا گھر ایک سرائے بن گیا تھا۔ کچھ تو اصغر کی شادی میں شریک ہونے والے عزیز و اقارب تھے اور کچھ وہ مہمان جو دربار کا جشن دیکھنے کے لیے آئے تھے۔ گھر کی بیٹھنے والیاں دربار کی تیاریوں کا حال آئے گئے سے سنتیں، تیوریاں چڑھاتیں، کڑوے کسیلے منہ بناتیں اور پھر جلے کٹے اعتراضات کرتیں۔ جمال بیگم کہتیں:

"جھاڑو پھرے موئے فرنگی کی صورتوں پر۔ آوئی لوا یہ لال منہ کے بندر بادشاہت

دلّی کی شام

کرنی کیا جانیں۔ اب تو وہی مثل ہے مور کے پر لگا کر کوّا بھی بولا میں بھی موروں کا بادشاہ ہوں۔"

بیگم نہال جواب دیتیں:

"ارے بی اس کا ذکر کیا۔ وہ زمانے تو خواب ہو گئے۔ جب ہمارے بادشاہوں کی تخت نشینی ہوا کرتی تھی۔ دلّی سج دھج کر چوتھی کی دلہن معلوم ہوتی تھی اور جس روز سواری نکلتی تھی اس وقت کا تو پوچھنا ہی کیا خزانے کا منہ کھل جاتا تھا۔ سونے چاندی کے پھول لٹائے جاتے تھے، طلائی مہریں تھیا ورکی جاتی تھیں۔"

جمال بیگم اس زمانے کی فراغتیں سُن کر کہتیں:

"دیکھ لینا یہ خدائی خوار تو بس اینٹ پتھر ہی دیں گے اور ڈنکے یہ پیٹ رہے ہیں کہ جو میرے سورا جا کے نہیں۔"

بچّے البتہ خوش تھے۔ انھیں یہ خبر کیا تھی کہ دلّی کیا تھی اور کیا ہو گئی۔ انھوں نے اپنی عمر میں ایسا بڑا میلہ نہ دیکھا تھا۔ جشن اور اس کی حقیقت ان کے لیے ایک دلچسپ تماشا تھی۔ محلّے میں مرزا دودھ والے کی دوکان رات کو معمول سے زیادہ دیر تک کھلی رہنے لگی جہاں حجام، کلّن کبابی، صدیق بنیا اور بڑھئی بیٹھ کر شہر کے حالاتِ حاضرہ پر تنقید و تبصرہ کرتے۔ بڑھئی خلیفہ سے کہتا،

"میں نے کیا پیارے تیرے ان دناں لوبارے ہو رہے ہیں۔ رات تلک سارے جنوں کی چاند مونڈا کرتا ہے میار، دں کو نہ بھول جائیو۔ قسم ہے قلا اڈّو کی۔ نہیں تو یا درکھیو دن کو تارے دکھا دیں گے یا رخاں۔"

خلیفہ مسکرا کر کہتا:

"اپنا تو بتا پیارے۔ یہ جو تختوں پر تخت بنائے چلا جا رہا ہے۔ کیا تیری اماں مرحومہ کا جنازا نہائے گا؟ اب تیری بھی تو گانٹھ گرم ہو گی۔"

201

427

اور بڑھئ اللہ کی غیر متوقع مہربانیوں سے مشکور ہو کر کہتا:

"بس وِس نیلی چھتری والے کا شکر گزار بنتا ہوں۔ دھیلی روپیے روز کی دھیانگی ہو جاتی ہے۔ میں گنتے گا راس قابل کہاں" اور حقّہ کا دم لگانے لگتا۔ اس پر کلن کبابی کہتا:

"وی گوری چمڑی والوں کو دعا دو پیارے، وِنی کے صدقے میں یہ وارے نیارے ہو رہے ہیں"

اس پر مرزا دودھ والا منطقی پہلو سے اعتراض کرتا:

"وِی ہمارے عقل کے بیچ کے اندر یہ بات نہیں آئی۔ ابے ہمیں بھی تو بتلا کہ گوری چمڑی والوں کا اس میں کیا دخل ہے۔ اپنا رب دیتا ہے۔ وِسی کا دیا کھاتے ہیں"

اس پر کلن کبابی بولا:

"وئی مولوی کے پوتے اللہ کو ہم بھی مانتے ہیں۔ پر تو مجھے یہ بتا کبھی آسمان سے بھی تیرے گھر میں طباخ اُترا ہے؟ وئی اللہ کے دینے کے راستے ہیں۔ جو بادشاہ ہمارے شہر دِلّی میں دربار نہ کرتا تو یہ تر لوالے کہاں سے کھاتے پیارے۔ وِس کی جان کو دعا دو۔ اللہ نے وِس کے دل میں ہمارے شہر کی محبت ڈال دی۔ میرا ارشاد سُن۔ جو دربار یاں نہ ہوتا تو قسم ہے اُڑان جھنڈے کی دو دو دانوں کو ترستے" اور اس نے اپنی بات منوانے کو اپنے خم ٹھونک کر خوشی سے کہا: "دن رات رادھا ناچے گی۔ گھی کے چراغ جلیں گے۔ نہال ہو جاؤ گے پیارے۔ ہو کس کی ہوائیں مزے آجائیں گے یاروں"

اس پر خلیفہ سے بھی چپ کے بغیر نہ رہا گیا،

"تیری بات کچھ دل کو یاروں کے بھی لگتی ہے۔ دِلّی میں تو صبح سے شام تو رہی

دلّی کی شام

یہی دیکھ رہا ہوں۔ اب آنکھیں کھلتی جا رہی ہیں۔ ہُن برس رہا ہے ہُن۔ محمد شاہ رنگیلے کا تو نام ہی نام سُنا تھا۔ اِس وَخت تو یہ حالیت ہے کہ چاروُں طرف سے مانس اُمڈا اچلا آ رہا ہے۔ شہر میں جیسے بکرا عید پر ریوڑ آتے ہیں۔"

اتنے میں بڑھئی نے بات کاٹ دی اور اور کہا:

"تیری بات ہے تو ٹھیک پیارے پر یہ تو سوچ میں اسی مسئلے کے بیچ حیران ہوں کہ چڑیا چگ کے چلی جائے گی یا یہیں بسیرا لے گی؟"

صدیق بنیے نے بڑھئی کی ران پر تڑ سے ہاتھ مار کے کہا:

"وئی لکشمی آن کے ذلدی نہیں جاتی پیارے۔ نکاح کر کے بٹھالیں گے۔ جان تو اس غم میں نہ گھُل۔"

سب کو اس بات پر ہنسی آگئی اور مرزا نے کہا:

"وئی وہ تو ہندنی ہے۔ وِس سے کیسے نکاح کرے گا؟"

صدیق بنیے نے برجستہ جواب دیا۔

"وئی تو فکر نہ کر میری جان! فرما تو رہا ہوں پکڑ کر پھیرے کر لوں گا۔ ادر یار تو سمجھ گوَنا تو ہو ہی چکا۔"

مرزا دودھ والے سے نہ رہا گیا۔ وہ بولا:

"اماں چار دن کی چاندنی اور پھر وہی اندھیری رات۔ یہ بڑے کہہ گئے، نہ بھولنا یہ تھوڑے دِناں کا سبز باغ دِکھا رہے ہیں۔ پھر جڑوں سے اکھاڑ کر لے جائیں گے سارے دَرَخت۔ اور کیا کہوں وِن دَرَختوں کی یاد میں اب تلک دل روتا ہے۔ قسم ہے پاک پروردگار کی ذات کی ایسا ہرا بھرا دَرخت اُکھیڑا جس کے سایے میں سبھی پل رہے تھے۔ کِس کِس کو روؤں۔ ایسے ایسے کڑیل خب صورت شہزادے ذبح کیے جن کے نمونے اب تو ڑی نہ آسمان نے دیکھے نہ زمین نے۔ یا رو تم کچھ ہی کہو میرا

تو ماتھا ٹھنک رہا ہے۔" وہ اس وقت خاصا اُداس معلوم ہوتا تھا۔

صدیق بنیا اُکتا کر بولا؛

"وئی پیارے تجھ کو چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا دِکھتا ہے۔ ذرا میّا سے جاکے تو پوچھ کہیں محرم میں تو پیدا نہیں ہوا تھا۔ آج تو ڑی تیرے منہ سے کوئی خیر کا کلمہ کبھی نہیں سنا۔ قسم ہے بی دُوَیّ جان کی سات دسمبر کو دیکھیو پریاں ناچیں گی پریاں، اِندر کا اکھاڑا ہوگا۔ تو اُلّو کی انسل اپنے ٹھنٹھ پر بیٹھا گھگّو گھو بولتا رہیو۔"

مرزا نے کڑھاؤ ہیں کھینچا چلایا اور دودھ کی سطح پر جمی ہوئی بالائی کو ہٹا کر کڑھاؤ کے ایک کنارے لگا دیا اور لنگی سے ہاتھ پونچھتے ہوئے یہ مصرع پڑھا؛

"دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے"

اور تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولا؛

"ابے الّو کی دم فاختہ وہ زمانہ بھول گئے جب شہ بالم پر ظلم توڑے تھے۔ تمہرا لیوں کی بے حرمتی کی تھی ـــــ تمہاری کھال کھنچوا کر منڈے پہنے گا وِس وَخت بچّو مرزا کو یاد کرو گے۔"

"ابے بے فضول کی ٹیں ٹیں لگا رکھی ہے۔ تیرا کیا بگاڑا ہے۔ جو ابھی سے وِن سے دشمنا گی مول لے لی؟" صدیق اس طرح بگڑ کر بولا جیسے سرکارِ انگریزی کی پول کھول کر مرزا دودھ والے نے اسی کو گالی دیدی ہو......

مرزا دودھ والا تو ٹھنڈا سانس کھینچ کر چپ ہوگیا، لیکن کلّن کبابی، صدیق بنیا اور خلیفہ اور بڑھئی رات گئے بیٹھے ہوئے دربار اور بادشاہ سلامت کی باتیں کرتے اور مزے لیتے رہے۔ انھوں نے کبھی اصل بادشاہ تو اپنی آنکھوں سے دیکھا نہ تھا فقط بڑے بوڑھوں سے ان کے کرّ و فر اور دھوم دھام کی کہانیاں سنتے چلے آئے تھے۔ ایسا ان کا مشتاق اور منتظر ہونا تعجب خیز نہ تھا۔ دِلّی والے بھی عجب زندہ دل اور
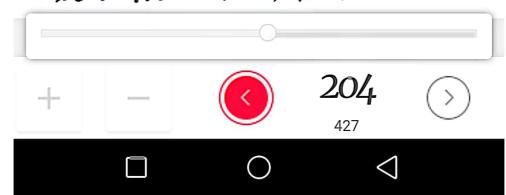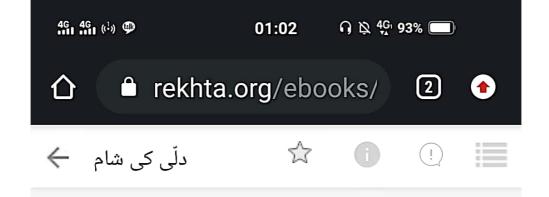
سیلانی لوگ ہیں۔ ہر ہنگام میں اپنی دل بستگی کا سامان ڈھونڈ لیتے ہیں۔ یہ ان کی فطرت ہے۔ میلوں ٹھیلوں میں جانا ان کو ورثے میں ملا ہے۔ تماش بینی میں ان کا مقابلہ ہندوستان کے کوئی اہلِ شہر آج تک نہ کر سکے ہیں۔ سنہ ستاون کے اس قیامت خیز غدر میں بھی وہ اپنی جولانیٔ طبع سے باز نہ آئے تھے۔ جب ہر طرف گولیاں جھڑ رہی تھیں، توپیں شعلوں کی طرح گولے اگل رہی تھیں یہ کوٹھوں اور چھتوں پر چڑھ کر تماشا دیکھتے اور شبِ برات کی آتش بازی کا مزہ لیتے۔

لیکن دلّی کے وہ ساکنانِ قدیم بھی تھے جنہوں نے اپنی آنکھوں شاہانِ مغلیہ کی آب و تاب اور ان کا رعب و دبدبہ دیکھا تھا۔ ان کو وہ رنگ آرائیاں یاد تھیں، ان کے سامنے اس دربار کے سارے تکلفات و اہتمام ہیچ تھے اور وہ ان سرگرمیوں سے نہ صرف بے تعلق تھے بلکہ ان پر ایک سکتے کا عالم تھا۔ اور کچھ وہ بھی دل جلے تھے جن کے عزیز و اقربا غدر کی آفتوں سے لُٹ پٹ کر نیست و نابود ہو چکے تھے۔ جشن کی تیاریاں دیکھ کر ان کے دلوں میں نفرت کا آتش فشاں کھول رہا تھا اور وہ گھروں میں بیٹھے ہوئے فرنگیوں کو کوس کاٹ کر جی کی بھڑاس نکال رہے تھے۔

؏ ؏ ؏ ؏ ؏

شمس کے سپرد دربار کے انتظامات تھے اور وہ لال قلعہ میں تعینات تھا۔ دربار سے دو روز پہلے گھر میں آ کر سب کو یہ خبر سنائی کہ رات کو قلعہ میں اچانک آگ لگ گئی اور بادشاہ سلامت کے واسطے جو مخصوص شہ نشین کثیر صرفے کی لاگت سے تعمیر کیا گیا تھا جل کر راکھ ہو گیا۔ اس شہ نشین کے واسطے نہ صرف بڑے بڑے راجہ مہاراجاؤں نے بیش بہا قالین اور انمول آرائشی سامان بھیجا تھا بلکہ پنجاب کے لاٹ بہادر نے بھی اپنی جیبِ خاص سے ذاتی عطیے دے کر آراستہ و پیراستہ کروایا تھا۔ نقصان بہت ہوا تعجب کی بات یہ ہے کہ اب تک یہ پتہ نہ چل سکا کہ آگ کیوں کر لگی اور کس کی

کارستانی تھی۔

میر نہال اور حبیب الدین جی ہی جی میں سن کر بہت خوش ہوئے۔ شمس البتہ منہ میں گھنگھنیاں بھرے بیٹھا رہا۔ وہ سرکار انگریزی کا نمک خوار تھا اور تقاضا ئے وفاداری بھی یہی تھا۔ بیگم نہال اس وقت بیٹھی ہوئی کرتی پر کٹاؤ کا پھول بنا رہی تھیں شمس سے جو آگ لگنے کی خبر سنی تو سینا پرونا چھوڑ کر کپڑے تہہ کر کے بقچی میں لپیٹ دیئے۔ اس خبر سے ان کو خاص مسرت ہوئی اور وہ زور زور سے کہنے لگیں:

"دیکھا اللہ کا قہر نازل ہو رہا ہے موئے فرنگیوں پر۔ کہتے ہیں خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ ہندوستان میں جو غضب ڈھائے اور بے گناہوں کا خون بہایا تو شہیدوں کا خون رنگ لائے بغیر نہیں رہے گا۔"

پھر وہ دور دیکھنے لگیں۔ ان کے چہرے پر تلخی کی شکنیں پڑ گئی تھیں۔ ان کو غدر کے ہولناک دن یاد آگئے۔ اور جیسے بھوبل میں دبی ہوئی چنگاری کو کسی نے کرید کر ہوا دیدی ہو۔ وہ غدر کے حالات سنانے لگیں:

"ان لال منہ کے بندروں نے کونسا ظلم اٹھا رکھا تھا جو نہ توڑا ہو۔ دلی کو لوٹ کھسوٹ کر تہس نہس کر دیا تھا۔ معصوم مسلمانوں کو گھروں میں گھس گھس کر نکالا شہر بدر کیا، اُن کی جائدادیں اور اثاثے قرق کر لیے اور مکانوں کو آگ دیدی۔ آن کی آن میں لاکھ کے گھر خاک تھے۔ اور کمپنی بہادر نے تو وہ مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی کہ خدا کی پناہ۔ پھول سی صورتیں جو ہاتھ لگائے سے میلی ہوں اور ان شہزادے شہزادیوں کو کھوتھے تیروں اڑا دیا۔ امیر غریب فقیر موئے چڑیا کے بچے پر بھی مسلمان ہونے کا گمان گزرتا تو تہہ تیغ کروا دیا جاتا۔ دلی میں خون کے دریا بہہ گئے۔ جنگل، بن، کہیں امان نہ تھی۔ خود اپنی آہٹ سے دل ہولتا تھا اور ہماری ہنستی کھیلتی دلی جس کے دن عید اور رات شب برات تھی پلک جھپکتے گورستان کی طرح اجاڑ و ویران ہو گئی نصیبوں جلی کا:

ایسا قلع قمع کر دیا کہ ہُو کا عالم تھا اور دن کو اُلّو بولتے تھے۔ ڈھنڈار مکان اپنے مکینوں کو یاد کرتے تھے۔ گلی کوچوں میں حسرت برستی تھی۔ جدھر دیکھو گدھ منڈلاتے نظر آتے۔ جب بھی وہ مصیبت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے کلیجہ دہل جاتا ہے اور سینے پر سانپ سا لوٹنے لگتا ہے۔ ان قزّاقوں سے تو اللہ ہی ہمارا بدلہ لے گا....“
اتنا کہہ کر ان کی آنکھوں میں اشکِ غم جھلک آئے۔

جمال بیگم نے ایک آہ بھر کے کہا:

”بُوا بائیس خواجہ کی چوکھٹ اجاڑی ہے۔ جیتے جی ان کے منہ سوّر کے سے ہو جائیں گے....“

سینوں میں جوشِ انتقام اور جذبۂ غیظ و غضب سر اٹھاتا، لیکن وہ سب بے بس اور لاچار تھے۔ ان کے بنائے کچھ نہ بن سکتی تھی....

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

دلّی میں آج بھی سینکڑوں غدر کی ماری شہزادیاں اور آفت رسیدہ شہزادے، بہادر شاہ کے پوتے پڑپوتے، دربدر ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ نہ ان کا کوئی ولی ہے نہ وارث، نہ ٹھور ہے نہ ٹھکانہ۔ سراسیمگی اور کس مپرسی کا ایسا شکار ہوئے کہ کسی شہزادی کو جاٹ اٹھا کر لے گئے تو کوئی کہاروں اور گوجروں کے ہتّے چڑھی۔ جو قبضۂ ناجائز سے بچیں، وہ ماماگیری کرنے لگیں۔ پیٹ کی دوزخ کو ٹھنڈا کرنے کو شہزادوں کو ہر ذلیل سے ذلیل اور ادنٰی سے ادنٰی پیشہ اختیار کرنا پڑا۔ کوئی بیل گاڑی اور تانگا ہانکنے لگا اور کوئی گھسیارا بن گیا۔ معدودے چند تھے جنہوں نے اپنے حق اور وراثت کے لیے عرضیاں گزاریں اور پانچ دس روپے ماہانہ کے وثیقہ دار بن گئے۔ اور کچھ وہ بے نصیب بھی تھے جو ہمیشہ کو گم کردۂ عزّت و ناموس ہو گئے اور جن کے حصّے میں ہمیشہ کو گداگری مقرر ہوئی۔

ان ہی میں بی گل بانو تھیں جو بہادر شاہ کی پرنواسی تھیں۔ غدر میں ان کی عمر سات برس کی تھی جب اپنے رشتہ داروں اور والدین کے ہمراہ قلعۂ معلّیٰ کو چھوڑ کر بھاگیں۔ ان کے سب عزیز تو غدر کے زمانے ہی میں ہیضے کی نذر ہو گئے تھے اور کمسن بیں یہ یکہ و تنہا اور بے یار و مددگار رہ گئیں۔ جب غدر کا جاں فرسا طوفان اور طوائف الملوکی کی یورش ختم ہوئی اور دلّی کی حالت قدرے سنبھلی اور امن ہوئی تو یہ بھی کسی طرح دلّی واپس آ گئیں، مگر کایا پلیٹ ہو چکی تھی۔ اب ان کو یہاں پہچاننے والا کوئی نہ تھا، اور ان کو روٹیوں کے لالے پڑ گئے۔ بھری دلّی میں ان کا پرسانِ حال ایک چوہے کا بچہ بھی نہ نکلا۔ سرکارِ انگریزی کے خوف سے لوگ شہزادے اور شہزادیوں کو نوکریاں بھی نہ دیتے تھے کہ کہیں وہ خود گرفت میں نہ آ جائیں۔ ناچار مجبور ہو کر انھوں نے اپنے ہی نانا ظفر شاہ کے طباخی سے نکاح کر لیا۔ وہ جب تک زندہ رہا ان کو طرح طرح دق کر کے اذیتیں پہنچاتا رہا۔ اس کے مرنے کے بعد وہ پھر بے سہارا ہو گئیں اور ایسی بپتا پڑی کہ مانگ کھانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

دربار سے ایک دن پہلے وہ میری ننہال کے ہاں آ نکلیں۔ وہ اکثر آتی رہتی تھیں۔ ان کی پیشانی کشادہ، رنگ میدہ و شہاب اور بڑی بڑی خوب صورت آنکھیں۔ گو وقت کے ناروا سلوک اور گردشِ جہاں نے سینکڑوں شکنیں ان کے چہرے پر ڈال دی تھیں مگر خط و خال کے نقشے اب بھی کہہ رہے تھے کہ اپنے زمانے میں حسینوں کی حسین ہی ہوں گی۔ بہادر شاہ کا کلام پڑھنا ممنوع تھا مگر دلوں پر پہرے نہ بٹھائے جا سکتے تھے، اور منادی کے باوجود دلّی والوں کو پوری غزلیں حفظ تھیں۔ گل بانو بھی آ کر بیٹھ جاتیں اور اپنے نانا کا کلام انتہائی سوگوارے میں گاتیں اور اس طرح جو کوئی کچھ دے دیتا لے لیتیں۔ خود منہ سے کبھی نہ مانگتیں اور نہ کسی کے سامنے ہاتھ ہی دراز کرتیں۔

میں نے ان سے پوچھا:۔

"بوا تم نے کبھی دربار کی روشنیاں دیکھیں، کیسی ہیں؟ تمہارے وقت میں بھی دلّی ایسی ہی سجا کرتی تھی؟"

مہرو نے ویسے ہی سادہ سوال کیا تھا مگر گُل بانو کا دل تو داغ داغ تھا۔ سمجھیں مہرو ان کی تحقیر کر رہی ہے۔ بولیں:

"بچی ہم سے تمسخر کر کے تم کو کیا ملے گا؟ ہم تو پہلے ہی ستائے ہوئے ہیں۔"

مہرو کہنے لگی:

"اچھی بوا میں نے تمہارا دل توڑنے کو تھوڑی ہی کہا تھا۔ میں تو پوچھ رہی تھی۔"

"بیٹی پوچھنے کو اب ہمارے پاس کیا رہا ہے۔ کبھی ہمارا بھی وقت تھا۔ ہم بھی شاہوں کے شاہ تھے۔ ہمارے جاہ و جلال کے سامنے بڑے بڑے تاجدار مات کھاتے تھے۔ ہمارا دور ختم ہوا۔ نہ وہ زمین ہے نہ وہ آسمان۔ مقدر نے کیا آنکھیں پھیریں زمانہ ہی بدل گیا۔ اب کارکنانِ قضا و قدر وہی ہیں۔ چمن اُن کا ہے بہار اُن کی۔ ہم کس گنتی شمار میں؟ ہم تو خارِ ہستی ہیں اور ننگِ جہاں......" کچھ تلخ اور طنزیہ ہنسی ہنس کر خاموش ہو گئیں۔

مہرو اپنے کہے پر نادم ہو کر بے حس و حرکت بیٹھی ہوئی گُل بانو کو دیکھ رہی تھی۔ اس وقت ان کے چہرے پر حزن و ملال تھا۔ روشن زمانے کی یاد نے آ کر ان کی آنکھوں میں آنسوؤں سے چراغاں کر دیا اور وہ پھر کہنے لگیں:

"کبھی ہمارے دروازے پر ہاتھی جھومتے تھے، نوبت بجتی تھی، لونڈی غلام حکم کے منتظر کھڑے رہتے تھے۔ مگر وہ بساط ہی اُلٹ گئی، وہ نقشے ہی مٹ گئے۔ خدا جسے چاہے عزّت دے جسے چاہے ذِلت۔ آج ہم ذلیل و خوار ہیں۔ کل کی بات ہے ہم بھی تاج و تخت والے تھے۔ وہ آئے اور ہمیں تاراج کر دیا۔ اِن نامراد آنکھوں نے اپنے سامنے شہزادوں کو شہید ہوتے دیکھا۔ ان کے نازوں سے پالے

01:15 92%

rekhta.org/ebooks/

دلّی کی شام

پھول سے جسم سنگینوں اور بھالوں سے چھلنی چھلنی ہو کر خاک و خون میں تڑپتے دیکھے۔ ظالموں نے معصوموں کا جینا جیتا خون پیا۔ ہم نے یہ سب دیکھا اور یہ سب دیکھ کر بھی ان بدنصیب آنکھوں کا نور نہ گیا۔ ہائے یہ دیکھنے سے پہلے ہی اندھی کیوں نہ ہو گئیں؟ جانے والے چلے گئے اور نیرنگیٔ زمانہ کی بیداد سے محفوظ ہو کر چین کی نیند سو رہے ہیں اور ہم وقت کی کاری ضربیں کھانے اور تلخیٔ حیات پینے کو زندہ رہ گئے۔ مگر بیٹی نہ وہ رہا نہ یہ رہے گا۔ دنیا چند روزہ ہے۔ رنج و الم، عیش و عشرت ماضی، حال، مستقبل سب کو زوال ہے۔ کون رہا ہے کون رہ جائے گا۔ سب وقت کے چہرے پر گزرتی ہوئی نشاط و الم کی پرچھائیاں ہیں۔ ماسوا اس کے کچھ نہیں...“

ان کا پوپلا منہ شدتِ جذبات سے کپکپا رہا تھا اور آنسوؤں کا تار بندھ کر جھرّی دار چہرہ بھیگ گیا اور رنج و کرب سے صورت بگڑ گئی، بیگم نہال اور جمال بیگم ان کے قریب بیٹھی پتھر کے جگر سے یہ داستان سن رہی تھیں۔ دونوں نے ایک لمبی آہ بھری اور گل بانو کی حالتِ زار پر تاسف کرنے لگیں۔ بیگم نہال اٹھیں اور کٹورے میں پانی لے آئیں۔ جمال بیگم نے ان کو پان دیا مگر وہ حسرت کا مرقع بنی ہوئی یادوں میں گم بیٹھی تھیں اور ان کی نگاہیں موجودہ منظر سے کہیں دور خلا کی بے پایاں وسعتوں میں ایک حسین و سہانی دنیا کا وجود تلاش کر رہی تھیں جہاں کارزارِ حیات کے یہ آزار اور کلفتیں نہ ہوں...... پھر وہ خود ہی ایک وجدانی کیفیت میں یہ غزل گانے لگیں؛

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں غم ستم کا میں کیا بیاں میرا غم سے سینہ فگار ہے
نہ تھا شہر دلی یہ تھا چمن کہوں کس طرح کا تھا یاں امن
جو خطاب تھا سو مٹا دیا فقط اب تو اُجڑا دیار ہے

210

427

یہ رعایا ہند تباہ ہوئی کہوں ان پہ کیسی جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکمِ وقت نے کہا یہ تو قابلِ دار ہے

وحیدہ بیگم اور کلیم بیگم بھی آ کر بیٹھ گئی تھیں۔ سب زار و قطار رو رہے تھے۔ اور جب اس شعر پر پہنچیں:

نہ دیا کسی نے کفن انھیں نہ دبایا زیرِ زمیں انھیں
نہ ہوا نصیب وطن انھیں نہ کہیں نشانِ مزار ہے

تو گل بانو کی آواز بھرا گئی اور لفظ نکلنے بند ہو گئے۔ انھوں نے اپنا منہ دوپٹے میں چھپالیا۔ سب کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ یہ روداد غم گل بانو کی آپ بیتی نہ تھی بلکہ ان سب کی داستانِ رنج و الم تھی۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

میر نہال اور حبیب الدین کے پاس مردانے میں کمبل شاہ بیٹھے ہوئے تھے۔ اور مغلوں کے زوال پر تبادلۂ خیال ہو رہا تھا۔ میر نہال کہنے لگے:

"بہادر شاہ کی دوسری بیگم خاص زینت محل اگر اپنے بیٹے جواں بخت کو ولیعہد بنا کر تخت و تاج کا وارث بنانے کا شاخسانہ نہ اٹھاتیں تو آج ہم غیروں کے اسیر نہ ہوتے۔ انھوں نے بیٹے کو بادشاہ بنوانے کی ہوس میں اپنے ہم وطنوں سے غداری کی۔ فرنگیوں سے سازباز کرنے میں صریحاً ان ہی کا ہاتھ تھا۔ فرنگی سیاست میں گرو گھنٹال ہے چنانچہ زینت محل سے وعدہ کر لیا کہ جواں بخت کو ہی تخت نشین کریں گے۔ یہ بھی ان کی شاطرانہ چال تھی۔"

اس پر حبیب الدین کہنے لگے:

اگر مرزا خضر بیگ اور مرزا مغل، بخت خاں کی تجویز مان لیتے تو انگریزوں کو قطعی شکست فاش ہوتی۔ انھوں نے بخت خاں کی باتوں
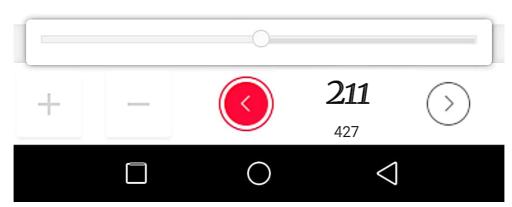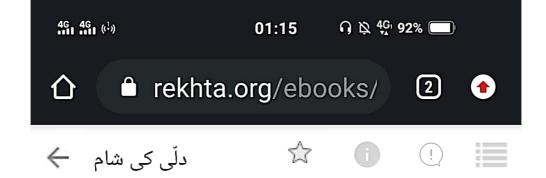
پر سرے سے کان ہی نہ دھرا۔ رہے صاحب عالم اور شہزادہ عالم تو وہ فنِ لشکر کشی سے کورے تھے اور اسالیبِ جنگ سے نابلد اور لشکری ان کا حکم ماننے سے انکار کر دیتے تھے۔ بخت خاں نے بہتیری التجا کی کہ عنانِ افواج اس کو سونپ دی جائے لیکن شہزادے اس پر کبھی راضی نہ ہوئے اور نتیجہ یہی ہونا تھا۔ مگر میں تو بخت خاں کی شجاعت پر آفریں کہوں گا کہ آخری دم تک انگریزوں کے حملے پر حملے کا مقابلہ کرتا رہا، یہاں تک کہ جب دلّی کا بھی محاصرہ ہو گیا اس نے بہادر شاہ سے عرض کی کہ جہاں پناہ میری مانیے ابھی وقت ہے۔ قلعہ کو چھوڑ کر میرے ہمراہ چلیے اور پہاڑوں میں چھپ کر نئے سرے سے فوج کی تنظیم کیجیے۔ چوہے دان میں بند ہو کر چوہے کی سی ذلیل موت مرنے سے جرأت مندی و دانائی سے مقابلہ کر کے شہید ہونا بہتر ہے۔ اس کا اثر یہ بھی ہوگا کہ تمام راجہ مہاراجہ اور والیانِ ریاست آپ کی مدد کو کمک بھیج دیں گے اور سب متحد ہو کر ایک ساتھ غنیم پر ہلّہ بول دیں گے۔ انگریزوں کی فتح کا سبب یہ ہے کہ ان کا مورچہ پہاڑی پر ہے اور دلّی نشیب میں، اور جب ہم پہاڑوں سے لڑیں گے تو ہمارا پلّہ بھاری ہو جائے گا۔

"ایسٹ انڈیا کمپنی کی سازشوں کا بھانڈا تو پہلے ہی پھوٹ چکا تھا اور ساری ریاستیں اس سے متنفر ہو کر اس کی دشمن ہو چکی تھیں۔ اور جنگی نقطۂ نظر سے یہ بات دور رس اور فہم و ادراک کی تھی اور جب سارے ہندوستان کی قوت جم کر ایک طرف ہو جاتی تو انگریز تو کیا رستمِ زماں کو بھی ملک کے باہر پھینک دیا جاتا۔ مگر کیا کیا جائے۔ اس میں بہادر شاہ خود بدولت سراسر قصوروار تھے۔ حکومت اور سیاسی معاملے میں نہ تو دور اندیشی سے کام لیا اور نہ کوئی نقصان ہی گوارا کی، اور خوشامدیوں کے ہاتھوں میں کھیلتے رہے۔ فرماں روا سے زیادہ ان کی حیثیت ایک کھلونے کی سی ہو کر رہ گئی تھی۔ سب کے سامنے اپنے کو مظلوم بنا کر پیش کرتے میں انہیں مزہ آتا تھا۔
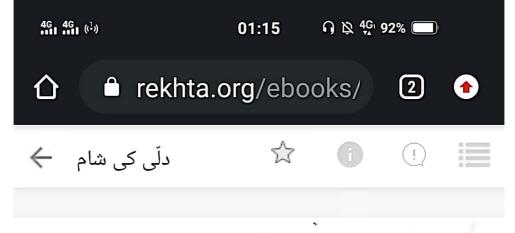
ان کے اس فعل میں ان کی فطرتِ صوفیانہ کو بھی بہ درجۂ اتم دخل تھا۔ وہ درویشانہ زندگی گزارنے کے قائل تھے۔ مشکلات سے ہمیشہ گریز کیا۔ یہی وجہ تھی کہ مرزا الٰہی بخش نے جو انگریزوں کا وفادار جاسوس اور بن داموں کا غلام بن چکا تھا عالم پناہ پر اپنی چرب زبانی سے ڈورے ڈال کر وہ ردّا چڑھایا اور وعدوں کے ایسے سبز باغ دکھائے کہ بہادر شاہ [illegible] خبطی ہو گئے۔ لیکن فرنگیوں کے سب وعدے وعید کا حشر کیا ہوا کہ خود قید ہوئے، غدر پڑا اور لوگ شہید ہوئے۔ ایک مصلحتی غلطی نے مغلوں کی قدیم پُرشکوہ سلطنت کو ملیامیٹ کر دیا۔"

اتنا کہہ کر حبیب الدین چپ ہو گئے۔ اُن کے چہرے پر تلخی جھلک آئی تھی اور پرانی یادوں سے وہ آزردہ نظر آ رہے تھے۔ میر نہالی نے بیٹے کی پُرخیالی باتیں سُن کر اطمینان و سکون کا سانس لیا۔ کمبل شاہ نے جو ابھی تک بڑی خاموشی سے باتیں سُن رہے تھے اپنے گرد کمبل کو اچھی طرح لپیٹا اور اس طرح سے بولے کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ جو کچھ کہنے والے ہیں اس کو سننے کے بعد کسی کو ایک حرف کہنے کی گنجائش نہ ہوگی۔

"بیٹا تم بچے ہو۔ تم نے ظاہری اسباب و علل دیکھ لیے۔ لیکن مغلوں کا زوال کیوں ہوا؟ یہ نازک مسئلہ ہے۔ یوں کہو کہ قادرِ مطلق کا منشا ہی یہی تھا۔ بہادر شاہ تو کیا اگر ہفت اقلیم کے بادشاہ بھی آ کر انگریزوں کو نکالنا چاہتے تو ظفریاب نہ ہوتے۔ کیونکہ ان کے بزرگوں سے کچھ ایسی غلطیاں سرزد ہوئی تھیں جن کی سزا ملنی لازمی تھی۔ بھلا محب و محبوب کو جدا کرنے کا انھیں کیا حق تھا؟ مگر انھوں نے زعمِ حکومت میں کیا۔ محمد شاہ کو حضرت محبوب الٰہیؒ اور امیر خسروؒ کے درمیان دفنا کر انھوں نے وہ گناہِ عظیم کیا جو ناقابلِ معافی ہے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ اور امیر خسروؒ ایک دوسرے کے عاشق زار تھے۔ محبوب الٰہی کا فرمانا تھا کہ اگر اسلام اس بات کی

اجازت دیتا کہ دو آدمی ایک قبر میں دفن کر دیے جائیں تو میری اور خسرو کی قبر ایک ہی ہوتی جس درجہ محبوب الٰہی کو حضرت امیر خسرو سے عشق تھا یہ حرکت ناجائز تھی کہ تیسرے شخص کو درمیان میں لا کر عاشق و معشوق میں پردہ حائل کر دیا جائے۔ چنانچہ مغل اور ان کی سلطنت صفحۂ دنیا سے مٹ گئی۔ کاملین اور اللہ کے محبوبوں سے ضد باندھنی تباہی کا پیش خیمہ ہے اور ان کے معاملات میں دخل اندازی کا یہی انجام۔"

کمبل شاہ سے وضاحت سن کر میر نہال کے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی، اور حبیب الدین کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے جوش عقیدت سے اپنے سر جھکا لیے۔ دونوں کو یقین تھا کہ کمبل شاہ محض درویش ہی نہیں بلکہ ان کا درجہ قطب کا ہے اور ان کی بات حرف بہ حرف صحیح ہے اور رازِ خداوندی کا انکشاف کرتی ہے۔ مگر اس کے باوجود جو تنزل کی گھٹائیں ادبار کی برق گرا چکی تھیں وہاں تمنائے گل و لالہ عبث اور سعی بے سود تھی۔

۸
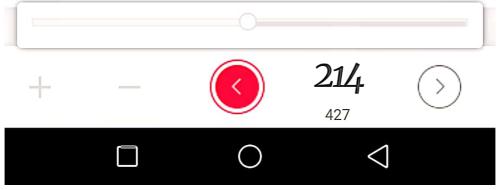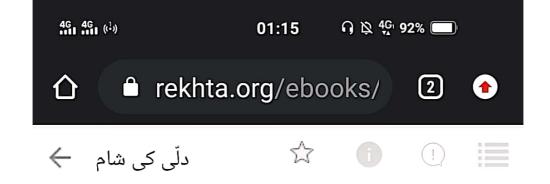
۱۹۱۱ء دسمبر کی سات تاریخ تھی اور دربار کی ہونے والی صبح۔ آج دلّی تاروں کی چھاؤں میں بیدار ہو گئی تھی اور دلّی والے تیار ہو ہو کر جامع مسجد کو روانہ ہونے لگے۔ غفور تو آج الغارزن تیل بہا کر تہجّد کے وقت ہی سے تیار بیٹھا تھا اور اس نے منہ اندھیرے سے سب کو جگا دیا تھا۔ میر نہال کی طبیعت جانے کو مطلق نہ چاہتی تھی مگر ان کے سب بیٹے سر ہو گئے، اور بچوں کی خوشی کرنے کو بادلِ ناخواستہ آمادہ ہو گئے۔ لڑکوں بالوں نے جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر بڑھیا بڑھیا کپڑے پہنے اور اپنی جیبوں میں خشک میوہ بھر لیا۔ سردی زیادہ تھی۔ میر نہال نے بھی اپنا جامہ وار کا کشمشی چغہ جس پر اودی کیریوں کی ترنج بنی ہوئی تھی پہن لیا۔ حبیب الدین کا چار سالہ لڑکا نسیم اپنے بڑے بھائیوں کو جاتا دیکھ کر چلنے کے لیے مچل رہا تھا۔ آخر میر نہال نے اس کو بھی تیار کروا کے غفور کے کاندھوں پر سوار کروا دیا۔ بچوں سمیت جب یہ گھر سے چلے ہیں تو رات بھیگ چکی تھی اور آسمان پر ڈوبے ہوئے ستاروں کا ہلکا ہلکا غبار باقی تھا۔
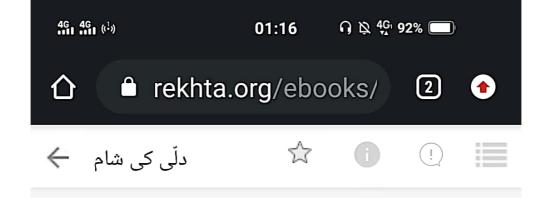
اصغر اور سرور کے حوالے سب چھوٹے بچے کر دیئے گئے اور وہاں ان سب پر نظر رکھنے کو میر نہال خود موجود تھے۔ اس وقت بے حد سردی تھی۔ دسمبر کی یخ بستہ ہوائیں جسم کو کاٹتی ہوئی جگر کے پار ہوئی جاتی تھیں۔ ٹھنڈک سے خون منجمد ہو کر ناک اور کان سُن ہو گئے تھے اور انگلیاں ٹھنڈ سے گلی جاتیں۔ دانت سردی سے کٹ کٹ بجے جاتے اور بدن میں ہر سرد جھونکے کے ساتھ تھرتھریاں چھوٹ جاتی تھیں۔ لوگ بہت پھرتی سے چل رہے تھے تاکہ کچھ تو گرما جائیں۔

میر نہال جس وقت جامع مسجد پہنچے تو صبح کا ستارہ افق کے آخری سرے پر اب تک روشن تھا اور کہر کی وجہ سے اس کی روشنی نیلگوں ہو گئی تھی۔ لوگ ان سے کہیں پہلے آن آن کر لکڑی کے چبوتروں پر جگہ گھیر چکے تھے۔ میر نہال آگے بڑھے مگر سیڑھیوں پر بھی مخلوق آ کر بیٹھ چکی تھی۔ میر نہال بیٹوں پوتوں اور نواسوں کے لاؤ لشکر کے ساتھ اِدھر اُدھر پھرے اور بہ دقت تمام ایک آرام دہ جگہ تلاش کر کے سیڑھیوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی سلوں پر بیٹھ گئے جو شبنم سے گیلی ہو رہی تھیں۔ نسیم غفور کے کندھے لگے لگے راستہ ہی میں سو گیا تھا۔ بیٹھنے کے بعد اس نے نسیم کو اپنی گود میں لٹا لیا۔ صبح کا ستارہ کچھ دیر ٹمٹمایا اور پھر ڈوب گیا۔ ہلکی فیروزی روشنی کی تحریر مشرقی کناروں میں پھیل گئی۔ چمگادڑوں اور بڑ باگڑوں نے سروں پر چکر کاٹے اور میناروں کے اندر اٹک گئیں۔

محافظ دستے کے سپاہی جابجا گشت کر رہے تھے اور گورے قواعد کرتے ہوئے سڑک پر دور تک چلے جاتے۔ کپتان حکم دیتا۔ پردیسی زبان کا کڑاکا اُبھرتا اور وہ اسی طرح واپس آ جاتے۔ لوگوں کے ہنسی ٹھٹھے کا شور اور بات چیت کا غل غپاڑا ہوا میں گونج رہا تھا جس میں سپاہیوں کی گاہ بہ گاہ بجتی ہوئی سیٹیوں کی آواز اور فوجیوں کے قدموں کی منظم چاپ بھی سنائی دیتی۔
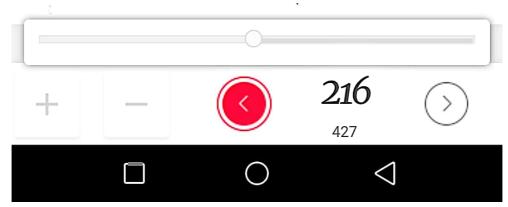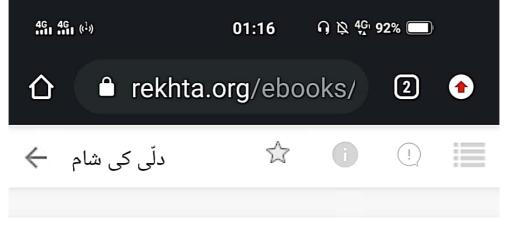
کہر بہت گہری تھی اور آنکھوں میں گھسی جاتی تھی۔ بیٹھنے والوں کو سردی سے چھینکیں آرہی تھیں۔ لوگوں نے ملیدے کے تکونے رومالوں سے کان ڈھک رکھے تھے۔ بعضے بعضے بڈھے بڑے روئی کے کنٹوپ اور اونی ٹوپیاں اوڑھ کر آئے تھے۔ اور وہ سب سُو سُو کر کے اپنے ہاتھ رگڑ رگڑ کر گرم کر رہے تھے اور ساری خلقت ٹھٹکڑی سکڑائی بیٹھی ہوئی سویرا ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ زمین سے آسمان تک کہر کا دھواں ہی دھواں پھیلا ہوا تھا۔

خدا خدا کر کے صبح کاذب کا دودھیا اندھیرا گھٹا اور صبح کی نقرئی روشنی دھیرے دھیرے بڑھی۔ کچھ دیر بعد بامِ مشرق پر آفتاب کی پہلی شوخ و شنگ کرن مسکرائی اور جھلک جھلک کر دامنِ کہر سے جھانکا۔ روشنی کے ہلکے عکس میں ہر چیز بالکل سرمئی نظر آنے لگی۔ فضا خنک تھی اور سماں سہانا۔ درختوں پر سے کوے پھڑپھڑا کر مختلف سمتوں میں اُڑنے لگے اور چڑیوں نے چوں چوں شروع کر دی تھوڑی دیر بعد اپنی قرمزی اور ارغوانی شعاعوں کی جلو میں سردی سے کانپتا ہوا خورشید نکل آیا۔ لال قلعہ کے کنگورے سُرخ شعاعوں میں نہا کر یاقوتی ہو گئے۔

گوری پلٹنوں کے دستے سڑکوں پر قطار در قطار استادہ ہو چکے تھے اور اس طرح چوکس کھڑے تھے کہ انکو دیکھ کر شبہ ہوتا تھا کہ مبادا ہجوم میں سے کوئی دل جلا بادشاہ کی سواری آنے پر ان کے بادشاہ پر حملہ نہ کر دے۔ جب آفتاب اور بلند ہوا تو کہر کے سرمئی بادل چھٹ گئے۔ چاروں طرف روشنی ہی روشنی پھیل گئی اور شعاعوں کی حدت سے ٹھٹھرے ہوئے جسموں میں حرارت کی لہر دوڑ کر جانوں میں جان آ گئی۔ اوس کے قطرے الماس کی طرح جھل مل جھل مل جگمگا اُٹھے۔ لکھو کھا انسان بے مثال اور زرق برق کپڑوں میں منتظرِ دید نظر آ رہے تھے۔

آخر کار سلامی کی توپیں داغی جانے لگیں اور بادشاہ سلامت کی آمد کا

غلغلہ بلند ہوا۔ کروڑوں پُر شوق نگاہیں لال قلعہ کے دروازے پر جم گئیں۔ گولوں کے دھما کے ساتھ ہی ہجوم میں ایک نعرہ بے ساختہ بلند ہوا۔ معلوم ہوتا تھا کہ بادشاہ سیدھا ان ہی کے پاس آ گیا ہے۔

بہت دیر اور بڑے انتظاروں کے بعد لال قلعے کے وہ دروازے کھلے جن میں سے کبھی مغل شہنشاہ بڑے تزک و احتشام سے جلوہ گر ہوتے تھے۔ جلوس نکلنا شروع ہوا۔ پہلے پیدل سپاہی نیلی، سرخ اور سبز چار خانے کی وردیوں میں فوجی طبل و علم کے ساتھ ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے گزرے پھر ان کے پیچھے فوجوں کے دستے آنے لگے۔ ان کی وردیوں کے چمکتے ہوئے بٹن اور پیٹیاں اور ان کے کاندھوں پر رکھی ہوئی بھاری بھرکم سنگینوں کی انیاں جن پر سورج کی کرنیں پڑکر تر بہرے بناتیں اور آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرتی تھیں۔ اس کے بعد گھڑ سواروں کے جرار لشکر عسکری قوت کا زبردست مظاہرہ کرتے ہوئے آئے۔ عوام الناس حیرت و استعجاب سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بادشاہ سلامت کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگے۔ ان سواروں میں بادشاہ کو نہ دیکھ کر بہت سوں کو سخت مایوسی ہوئی۔ گھورتے گھورتے ان کی آنکھیں بھی دُکھنے لگیں اور وہ بے دلی سے ایک دوسرے سے کہنے لگے: اجی ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ سبھوں کے منہ لال چقندر اور صاحب کپڑے بھی ایک سے۔ دوسرا جواب دیتا۔ حضت ایک ہی سانچے کی ڈھلائی ہے۔ عجب مخلوق ہے نا معلوم کون سے ملک کا جناور ہے نہ بادشاہ میں فرق نہ سپاہی ہیں۔

جنہوں نے مغلوں کا ساتھ دیا تھا یا اپنا حق آزادی قائم رکھنا چاہا تھا، انھیں تو سرکش اور مفسد قرار دے کر غدر کے بعد ہی انگریزوں نے تلف کر دیا تھا۔ دوسروں کا یہ حشر ہوتا دیکھ کر سب کو اپنی اپنی پڑ گئی تھی اور بہت سے والیانِ ریاست کو اپنی جاگیروں اور گدیوں کی فکر جب

لاحق ہوئی تو انھوں نے اپنے منصب برقرار رکھنے کو انگریزوں کی اطاعت قبول کر کے ان کے وفادار رہنے کا بیڑا اٹھا لیا۔ اپنے وطن اور اپنے لوگوں سے یہ ایک طرح کی غداری تھی مگر ان کو نہ اس کا کچھ افسوس تھا نہ ملال، اور آج وہ سارے نواب رئیس بہ نفسِ نفیس خود دربار کے شاہی جلوس میں شامل تھے اور اس وقت ان ہی رجواڑوں اور جاگیرداروں کی سواریاں آ رہی تھیں جو بیش بہا زر و جواہر سے مرصع اطلس اور کمخواب کی پوشاکیں پہنے اپنے صافوں میں قیمتی سر پیچ لگائے ہوئے بڑی شان اور بڑے فخر سے اکڑے ہوئے بیٹھے تھے۔ میر نہال کی نگاہ جس دم ان پر پڑی تو حب الوطنی نے جوش مارا اور وہ غیرت سے زمین میں گڑ گئے۔ ان کا دل اندر ہی اندر اپنے ہم وطنوں کی دغابازی و فریب کاری پر غصہ و نفرت سے کٹا جاتا تھا۔ ان کے نزدیک ان گدی نشینوں کی وقعت ایک رہزن سے زیادہ نہ تھی۔ اور انھوں نے طنزیہ اپنے سے کہا، بڑے طرم خاں بن کر ہمارے غنیموں کے خیر خواہ بنے ہیں، اور پھر اپنے جوتے کی نوک کی طرف دیکھنے لگے۔ سواریاں گزرتی رہیں اور میر نہال گردن جھکائے ہوئے بے تعلق ہو کر سوچتے رہے۔

یہ وہی دلی ہے۔ یہ وہی راستے جن پر کبھی وہ بادشاہ گزرا کرتے تھے جن کی حکومت کا سکّہ سب کے دلوں پر تھا۔ وہ شہ و آفاق تاجدار گزر گئے۔ گو وہ خود صفحۂ ہستی سے مٹ چکے، ان کی سلطنت روئے زمین سے ختم ہوئی، مگر ان کا نام آج بھی باقی ہے حالانکہ وہ شاہ سطوت رہے نہ ان کا وہ طمطراق۔ اور یہ انگریز ایسے سبز قدم آئے کہ ملک ہی کا تیہ پانچہ کر کے اس کو تاراج کر دیا۔ ایک حاکم کو دوسرے حاکم کے خلاف اُبھارا، بھائی کو بھائی سے بدظن کیا، بیٹے کو باپ کا بدخواہ بنایا، جھوٹ اور نفاق کا بیج بو کر خود بیچ کے بچولیے بن گئے۔ جس کا پلّہ جھکتا دیکھا جھگا ڈر کی طرح اسی کی طرف ہو کر ایک کو سنائی تو دوسرے کو بدھائی دی۔ دغا و فریب کا ایسا کھیل

کھیلے کہ مہرہ سے مہرہ لڑ گیا۔ ہم بازی ہار بیٹھے اور ان کے پانسے سیدھے آئے اور انھوں نے بڑھ کر ہم کو زنجیریں پہنا دیں۔

آفتاب اونچا ہو کر سروں پر آ گیا تھا۔ گرمیں لوگوں کے چہروں پر پڑ رہی تھیں۔ گرمی سے پیشانیوں پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ اور گال تمتما اٹھے تھے۔ مہا راجگان کی گاڑیاں کبھی کی جا چکی تھیں۔ اور اب کھلی چوکڑیوں میں اور گھوڑوں پر لاٹھ بہادر گورنر، کرنیل، جرنیل اور کپتان اور دیگر بڑے بڑے عہدیداروں کا تانتا بندھ گیا تھا، جن کے ہمراہ بکتر بند سوار اور مسلح ٹامی، انگریزی سپاہ کے دستے جن میں دیسی جوان بھی تھے جو ہاتھوں میں برچھیاں اور تیغے سنبھالے شانوں پر بندوقیں رکھے چلے آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ دائیں بائیں آگے پیچھے بدیسی اسلحہ کی گاڑیاں اور اجنبی ساخت کی بھاری بھاری توپیں تھیں۔ ان کی نالیاں اور دہانے ان بیچارے عوام کی سمت جو اب محکوم اور غلام تھے اس طرح اٹھے ہوئے تھے گویا آج بھی وہ یہ دھمکیاں دے رہی تھیں کہ ہندوستان کو ہم ہی نے فتح کیا اور ہمارے ہی بل بوتے پر تم قابو میں بھی آئے ہو۔ اور میر نہال کو معاً یہ خیال آیا کہ کب تک یہ ہمیں اپنی دھاک بٹھا کر قبضہ میں رکھ سکیں گی۔ کیا یوں ہی ہم ہمیشہ غلام رہیں گے؟

میر نہال نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ پھر ڈالی اور انگریزوں کے لال بھبوکا چہرے دیکھ کر پھر ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ انھوں نے حقارت سے اپنا منھ پھیر لیا اور پھر ان کے خیالات کی کڑی سے کڑی مل گئی ہو نہ ہو یہ وہی تو فرنگی ہیں جو سات سمندر پار سے تجارت کے بہانے یہاں آئے اور چپہ سی بھر زمین مانگی اور اور حکومت کی ہوس میں کنکھجورے کی طرح پنجے گاڑ دیے۔ اور یہ تاجر آج ہمارے آقا بنے بیٹھے ہیں۔ میر نہال کا اس وقت جی چاہتا تھا یا تو زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائیں یا آسمان اتھل پتھل ہو جائے۔ فرنگی افواج ہنوز گزر رہی تھیں اور چیونٹیوں

کی قطار کی مانند سپاہیوں کی لمبی لکیر سڑک پر اس قدر آہستہ روی سے جا رہی تھی جیسے ان کا سلسلہ تا دمِ حشر اسی طرح قایم رہے گا۔

میر نہال کے واسطے یوں تو سارا نقشہ غیر مانوس اور اجنبی تھا جس سے ان کو قطعی دلچسپی نہ تھی مگر ہتھیاروں کی چمک دمک جن کی وجہ سے ہندوستان پر انگریزوں کو فتح حاصل ہوئی تھی اور فرنگیوں کی بے درد صورتیں نشتر کا کام کر رہی تھیں اور ان کے لیے یہ دیکھنا ناقابلِ برداشت ہو چکا تھا۔ یہ سب منظر بھلانے کو انھوں نے اپنی آنکھیں زور سے بند کر لیں مگر تلخ یادوں نے ان پر یلغار کر دی۔ اور ان کے ذہن میں تاریخ کا وہ باب کھل گیا جس کا ہر لفظ آنسوؤں سے رقم تھا اور ہر سطر خوں چکاں، انھوں نے اپنا دھیان بٹانے کو آنکھیں کھول دیں۔ ان کے سامنے شاہجہاں کا بنایا ہوا وہ لال قلعہ چپ چاپ کھڑا تھا جو آج تک ایک عالم میں سنگ تراشی اور صناعی کا بے مثال شاہکار ہے۔ اس میں شاہ جہاں کے جذباتِ حسن و جمال اور نزاکت اور لطافت کے دوش بدوش تیموری ارادوں کی بلندی، جراءت اور اولو العزمی بلکہ اس کے خوابِ حسن اور فکر و خیال کی پرواز بھی جلوہ گر نظر آ رہی تھی۔ اس حُسن کے پجاری نے کہیں سنگ و خشت کو جامع مسجد جیسی حسین و جمیل شکل عطا کی اور کہیں پُر شکوہ اور عظیم الشان لال قلعہ کو تشکیل دیا جسے اب ایک غیر قوم اس بے دردی سے روند رہی تھی۔ میر نہال کے داہنے ہاتھ پر شہر پناہ کی فصیلیں تھیں جن سے کوس بھر کے فاصلے پر خونی دروازہ دکھائی دے رہا تھا اور اس دروازے کے بیچ سے شیر شاہ کی بنائی ہوئی لمبی چوڑی سڑک عمرِ خضر کی طرح چلی جا رہی تھی جس کے شرق میں پرانا قلعہ تھا جس کو فیروز شاہ تغلق نے چھ سو برس پہلے تعمیر کیا تھا اور اسی سنہرے ماضی کی یادوہ سیم تن و مرمریں ہمایوں کا مقبرہ تھا اور قطب مینار جن کا سلسلہ جُگ جُگ پرانے ہستنا پور تک جا پہونچا تھا اور یہیں سے ہندوستان کے اس عہدِ قدیم کا سراغ ملتا ہے جب ہندوؤں کی عظیم الشان تہذیب پھل پھول
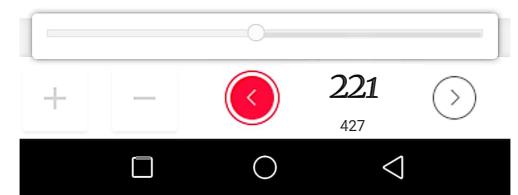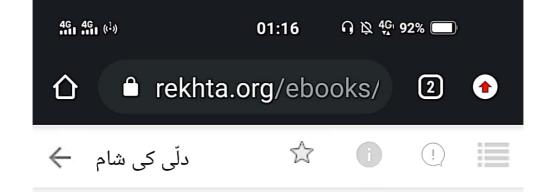
رہی تھی۔ کبھی اس خطّے کو انھوں نے اپنی راجدھانی کے لیے منتخب کیا تھا اور اس کا سنگِ بنیاد رکھنے سے پہلے نجومیوں اور جیوتشیوں نے رمل و نجوم سے نحس و سعد ساعتیں دیکھی تھیں، پھر مہورت لے کر دلّی کی اساس یہاں رکھی گئی تھی۔ اور ان قدیم دلّیوں کے بچے بچائے کھنڈرات ہستنا پور میں اب بھی موجود ہیں جو کبھی ہندوستان کا مایۂ ناز تھیں، اور جن کی شان و شوکت سے اس کی عظمت کا پتہ چلتا تھا، جب ان کے تمدن کا بول بالا تھا۔ تب دلّی کی شہرت کے چرچے جہاں گیر تھے اور سیّاح اس کی آن بان کے قصیدے پڑھتے تھے اور شاعر اس کی زیب و زینت کے گیت گاتے تھے۔ راجہ اشوک کے زمانے میں یہ اپنے منتہائے عروج و کمال پر تھی۔ مہرولی میں اشوکا کی لاٹھ اب تک کھڑی ہے جو اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ کبھی یہاں بھی زرّیں زمانے آئے تھے۔ یہاں کے زمان و مکاں بھی کبھی رفعت مآب تھے۔

اس سرزمین کو اپنے پر یہ غرور تھا کہ وہ ادرنگ زماں ہستیاں، وہ شہریار اور کجکلاہ اس میں رہتے بستے تھے جن کا جواب آفاق میں نہ تھا۔ کبھی اس میں وہ جیّد سلاطین، وہ قیصر و کسریٰ، وہ علوم و فنون والے حکومت کرتے تھے جن کی یکتائی اور جلالت کی نظیر تاریخ بھی نہ دے سکی اور آج اسی دلّی پر ایک نامہربان قوم نے اگر زبردستی اپنا تسلط جما لیا تھا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ ان فرنگیوں کو نہ ملک سے محبت تھی اور نہ اس کی قدر۔ پھر وہ اس کے سپوتوں کے رفیق و ہمدرد کیسے ہو سکتے تھے؟ وہ سر جو کبھی خم ہونا نہ جانتے تھے آج ان کی گردنوں میں غلامی کے طوق جھول رہے تھے۔

اب جلوس جامع مسجد کی طرف بڑھ رہا تھا اور گوروں کے رسالے اور ہندوستان کے ہراول کے سپاہی جو نئے نئے سرکارِ انگریزی کے نمک خوار بنے تھے اپنی نئی نئی وردیوں اور نئے نئے جنگی ہتھیاروں سے مزین سینہ تانے قدم اٹھا رہے تھے۔ جلوس اب
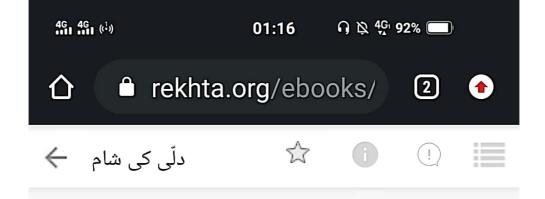
جامع مسجد کے عین مقابل آ چکا تھا۔ مُشکی گھوڑوں کے سُم سُرخ پتھر کی سلوں پر پڑتے تو نعلوں میں سے چنگاریاں نکلتیں۔ ٹاپوں سے سڑک کے پتھر بجتے اور بڑی دیر تک فضا میں آواز گونجتی رہتی۔ خلقت دیدے پھاڑ پھاڑ کر حیرت، تعجب اور رشک سے انھیں دیکھ رہی تھی۔ نئی بناوٹ کے ہتھیار، نئی قسم کے فوجی اور ولایتی بندوق طمنچے ان کی کشش کا باعث بنی ہوئی تھیں۔

مذہب اکثر ایسے ہاتھوں میں رہا ہے جنھیں اس سے تو کوئی سروکار نہیں ہوتا کہ مردہ دوزخ میں جائے گا یا جنت میں، انھیں محض اپنے حلوے مانڈے سے غرض ہوتی ہے چنانچہ اسلام کے کرتا دھرتا کٹھ ملاؤں نے عام مسلمانوں کے اصلی جذبات سے بالکل بیگانہ ہو کر محض اپنی طمع اور مطلب براری کے واسطے بادشاہ سلامت کی خدمت میں تمام مسلمانانِ دِلّی کی جانب سے ہدیۂ تہنیت پیش کیے تھے جو جامع مسجد کے صدر دروازے پر لٹکائے گئے تھے اور مزید خلوص و وفا اور اپنی نیک نیتی انگریزوں کو جتانے کے لیے ان پر پھولوں اور گوٹے کے ہار آویزاں کیے تھے۔ اور آج یہ بات خصوصاً اچھی طرح آشکارہ ہو چکی تھی کہ بعض لوگ مذہب کی اوٹ میں بدعنوانیاں کرتے ہیں اور محض اپنی عزّت خواہی کے لیے ان کا مذہب میں عمل دخل شقاوت اور چیرہ دستیوں کا سبب ہوتا ہے۔ جب کچھ علما شاہی جلوس میں ہاتھیوں پر بیٹھ کر نکلے تو دلّی والے تماشائیوں نے انھیں علمائے فیل کے خطاب سے سرفراز کیا۔

میر نہال سخت پشیمان ہو رہے تھے کہ ناحق سب کے کہنے سننے سے یہاں آ گئے ان کا دماغ پراگندہ تھا اور ایک خیال کے بعد دوسرا خیال ماضی اور شعور کے کونوں کھدروں میں سے نکل نکل کر انھیں اور زیادہ افسردہ کر دیتا۔

جامع مسجد میں لٹکے ہوئے ہاروں کو دیکھ کر انھوں نے پھر سوچا یہ وہی جامع مسجد ہے جس کو ڈھالنے کے لیے کتنی بہادر نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا اور کس قیامت کی

گرا دی گئی تھی۔ مگر جس کو خدا رکھے اسے کون چکھے۔ اس کی ایک اینٹ بھی اپنی جگہ سے نہ کھسکی، اور جب اس طرح بھی ان کو اپنے ارادوں میں کامیابی نصیب نہ ہوئی تو وہ اس کو گرجا گھر بنا دینے کے درپے ہو گئے۔ لیکن ان کا یہ حربہ بھی بروئے کار نہ آ سکا۔

اس خیال کے آتے ہی میر نہال کے مندمل زخم جیسے پھر سے ہرے ہو گئے جگر کی خراش لہو دینے لگی۔ ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

سن اٹھارہ سو ستاون دلّی کو راس نہ آیا لیکن چودہ ستمبر کا منحوس دن تو اس کے واسطے ہنگامِ مرگ تھا اور اس کا ابدی زوال۔ اس کی قسمت کا ستارہ ڈوب گیا اور وہ غارت اور تاراج ہو کر غیروں کی دست برد میں چلی گئی۔

اس جامع مسجد نے شاہی جلوس کے علاوہ بھی ایک اور منظر دیکھا تھا اور ان کو وہ المناک واقعہ اپنی پوری تباہیوں کے ساتھ یاد آ گیا۔ میر نہال اس وقت دس برس کے تھے اور انھوں نے وہ جاں گداز حقیقت اپنی ان ہی آنکھوں سے دیکھی تھی جن سے وہ آج تاج پوشی کا جلوس دیکھ رہے تھے۔

اس دن جمعہ کا روز تھا۔ ہمیشہ کی طرح ہزاروں مسلمان جمعہ کی نماز کو جامع مسجد میں جمع ہوئے تھے۔ شومئ تقدیر کہیے یا ہونے والی بات۔ اس دن ٹامس میٹکاف جو فرنگی مہم کی پیش قدمی کر رہا تھا، چار ماہ کی لگاتار منہ توڑ ناکامیوں کے بعد آخر شہر کی فصیلوں میں شگاف ڈالنے میں کامیاب ہو گیا اور بڑھتا ہوا اسپلینیڈ سڑک پر دارالشفا خیراتی شفا خانے کی آڑ لے کر اس نے جامع مسجد کو مسمار کرنے کے لیے پے درپے حملے شروع کر دیے۔ جب توپوں کی گھن گرج ہوئی تو سجدوں میں سرنگوں مسلمانوں کو یہ ہولناک خبر ملی۔ اس وقت ان کے سان و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ وقتِ شہادت اتنا قریب ہے۔ بارگاہِ خدا میں آنے والے بالکل نہتے تھے۔ دستور کے مطابق ان کی کمروں میں ایک ایک کٹاری یا خنجر لٹکا ہوا تھا۔ کچھ دیر تو اس خبر کو سننے

ہی سب پر سناٹا چھا گیا مگر مسلمان کبھی ایسے نازک موقعوں پر ہراساں نہیں ہوئے۔ اسی مجمع میں سے ایک مردِ میداں اٹھا اور تمام مسلمانوں کو ایک عجیب سرفروشانہ جذبہ و جوش میں گرج کر للکارا۔ میر نہال کے کانوں میں وہ آواز اور وہ الفاظ آج بھی اسی طرح گونج رہے تھے: "اے مومنو موت برحق ہے، اور ایک مسلمان کے لیے شہادت سے بہتر کوئی موت نہیں ہو سکتی۔ اپنی ابدی حیات کے طلبگار ہو تو میرے ساتھ آ جاؤ۔ آج ناموسِ اسلام خطرے میں ہے۔ ملّت پر بُرا وقت آن پڑا ہے۔ اٹھو اخوتِ حسینؓ تم کو پکار رہی ہے۔ نام خدا و رسول مٹانے والے کافروں کو مزہ چکھا دو۔ اور برادرانِ اسلام تم میں سے جس کو اپنی جان و دنیا عزیز ہے وہ شمالی دروازہ پر چلا جائے، کیونکہ اس طرف نہ دشمن ہے اور نہ موت۔" آخری جملہ کا ردِّ عمل یہ ہوا کہ سارے مسلمانوں نے مل کر ایک ساتھ اللہ اکبر کا فلک شگاف نعرہ لگایا۔ جامع مسجد کے درو دیوار، بام و گنبد نعرہ کے جلال سے ہل گئے۔ اگر اس وقت کوئی سپہری سے جری فاتحِ اعظم بھی ہوتا تو اس نعرہ کی گونج سے اس کا زہرا چھٹکر پانی پانی ہو جاتا۔ لیکن یہ جنگ توپ و تفنگ کی جنگ تھی۔

میر نہال اس لمحہ کو یاد کر کے ایک خاص فخر و سرور محسوس کر رہے تھے۔ ان مسلمانوں میں اسلام کی سچی وحدت اور حریت تھی۔ اور ملّت میں سے ایک بچہ بھی ایسا نہ تھا جو موت سے ڈر کر شمالی دروازہ پر چلا گیا ہو۔ تسبیح کے دانوں کی طرح وہ ایک ہی تاگے میں گندھ گئے تھے، اور ان کے عزم اتنے راسخ تھے کہ بڑی سے بڑی طاقت بھی ان کے قدم ڈگمگا نہ سکتی تھی۔

وہ مجاہدِ اسلام متحد ہو کر بڑی شان سے جنوبی دروازے پر آ گئے۔ آج ہر ایک خود اپنا سپہ سالار تھا۔ وہ کون تھا جو آج ان کے حوصلے پست کر دیتا۔ موت کے سامنے مسلمان کبھی سرنگوں نہیں ہوا۔ موت خود اس کی محافظ ہے۔ یہ ان کی ازلی شان تھی کہ

وہ مٹھی بھر مسلمان جو محض عبادت کے لیے مسجد میں آئے تھے سر پر کفن باندھ کر سر دھڑ کی بازی لگا بیٹھے۔ یہ قلیل تعداد اللہ اکبر کے نعرے لگاتی ہوئی سیلِ رواں کی طرح بڑھی اور حملہ آوروں کے سامنے ننگے سینے تان کر ڈٹ گئی۔ جامِ شہادت کے متوالوں میں سیماب کی تڑپ اور برق کی سرعت آ گئی۔ ان کے جگر پتھر کے ہو گئے اور خالی ہاتھ فولاد کے ہو کر ذوالفقار بن گئے۔ میٹکاف اپنے ہمراہیوں کے ساتھ سرغنہ بنا ہوا انتظار میں کھڑا تھا اور اس کے چاروں طرف ان جانبازوں کے کشتوں کے پشتے لگے ہوئے تھے جو پہلے ہی مذہب کے نام پر اپنی گردنیں کٹا چکے تھے۔ ان کی بے گور و کفن لاشوں کے ڈھیروں پر گدھ اور چیلوں کے جمگھٹ بیٹھے ہوئے چونچوں سے گوشت نوچ رہے تھے اور کتے ہڈیاں ہڈیاں الگ کرنے میں مشغول تھے۔ میٹکاف نے ہجوم کو دیکھتے ہی توپوں کو شتابے لگوا دیے۔ دھوئیں اور شعلوں کے بادل اٹھے اور گولوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ صفِ اول کے مجاہد اور اللہ کے گھر کی رفاقت میں بڑھنے والے اس کی سیڑھیوں کے پتھروں کو اپنے خونِ وفا سے رنگتے ہوئے عظمتِ خدا پر فدا ہو گئے۔

یہ دیکھ کر باقی مسلمانوں کے حوصلوں میں اور تازگی آ گئی اور یکبارگی ایک غیر فانی ولولۂ شہادت ان کے دلوں میں تڑپا۔ ایک غیبی قوت کی برقی رو تھی جو ان کو چھوتی ہوئی گزر گئی اور وہ یا علی کہہ کر زخمی عقاب کی طرح اندھا دھند جھپٹے اور مخالف کی سپاہ پر ٹوٹ پڑے۔ فرنگیوں کو یہ قطعاً امید نہ تھی اور مسلمانوں کے اس ناگہانی اور بھرپور حملے سے ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ بہت سے اپنی جان بچانے کو میدان چھوڑ کر بھاگنے لگے مگر یہ جتھہ مجاہد ان کا پیچھا کرتے اور ان کے سر آنِ واحد میں تن سے جدا کر دیتے۔ دلی کے مسلمانوں نے اس روز ایسا جی توڑ مقابلہ کیا کہ انگریز سپاہیوں کی ہمت ٹوٹ گئی اور ان کے چھکے چھوٹ گئے۔ وہ فرار ہو ہو کر گڑھ پر پہنچنے لگے جہاں ان کا پڑاؤ تھا اور گولہ بارود خانے تھے۔ مسلمان بھی بے تحاشا ان کے تعاقب میں بھاگ رہے تھے

مگران کے پاس نہ تیر و کمان تھے اور نہ شمشیریں، صرف ایک جان تھی اور ہتھیلی پر سر، دل میں مادر وطن کی محبت کا پاک جذبہ، یا پھران کی شجاعت۔ میٹکاف نے گرا تج پر دم لیتے ہی بیدردی سے توپوں کے دہانے ان کی طرف کھول دیے۔ گولیاں تڑاتڑ اولوں کی طرح برسنے لگیں اور یہ مجاہد دلوں میں گرمیٔ آزادی کی تمنا لے کر خاک پر ٹھنڈے ہو کر وطن اور مذہب پر قربان ہو گیے۔

آسمان پر خاک کے آتشیں بگولے اُڑ رہے تھے۔ پوری دلّی توپوں کی گرج سے سہم رہی تھی اور زمین پر خون شہیداں کے دریا بہہ رہے تھے۔ ایک آدھ جو گولہ بارود سے بچ رہا وہ شکستہ پا ہو کر لوٹ گیا مگر شہید نہ ہونے کا افسوس اس کی رُوح کو تلملاتا رہا۔

میر نہال کی نگاہوں کے سامنے یہ سارے مناظر موت و حیات کی وادیوں میں سے نکل کر ایک ایک کر کے آگیے۔ انھوں نے ٹھنڈا سانس لیا، اور ان کے دل نے کہا: اب نہ وہ دلّی رہی نہ وہ دل والے۔ ایک وہ ۱۸۵۷ء کے شجاع و جواں ہمت مسلمان تھے اور ایک یہ تماشائی۔ انھوں نے بیٹھے ہوئے مسلمانوں کے جمِ غفیر پر ایک حقارت بھری نظر ڈالی۔ یہ ۱۹۱۱ء کے بے غیرت مسلمان ہیں جو سینوں میں چڑیا کا دل لیے بیٹھے ہیں اور بے درد صیاد کی عطا کی ہوئی ذلت و خواری پر مطمئن اور خوش ہیں میر نہال کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ کثرتِ غم سے ان کی آنکھوں کے دو آبے گو خشک ہو چکے تھے مگر ان کا دل لہو کے آنسو بہا رہا تھا۔ جہاں کبھی وہ ہنگامِ قیامت اٹھا تھا۔ آج وہ جامع مسجد کی ان ہی سیڑھیوں پر گم سُم بیٹھے ہوئے اپنی دُنیا کو تباہ و برباد ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ اس دلّی پر جوان کو اپنے سے زیادہ عزیز تھی نزع کا عالم طاری ہو چکا تھا اور وہ مجبور و بے کس تھے۔

وقت کو قید نہیں کیا جا سکتا اور نہ گردشِ ایام پیچھے پلٹ کر آتی ہے میر نہال کا

وہ زمانہ جو دراصل ان کا اپنا تھا کبھی کا گزر کر قعرِ ماضی میں گر چکا تھا اور ان کی دنیا جب ہی تہہ و بالا ہو چکی تھی اور حال بے مروتی سے بے گانہ وار ان کے قریب سے آگے بڑھتا جا رہا تھا اور یہ ساعتیں سوگوار تھیں۔ پھر جب امید ہی بے سود تھی تو مستقبل کے پاس ان کے لیے کیا ہو سکتا تھا؟ اس خیال سے کہ ان کا دور ختم ہو چکا تھا، میر نہال کو ایسا محسوس ہوا گویا آغوشِ جہاں میں وہ بالکل تنہا ہیں۔ اور یہ حقیقت کہ ان کی دنیا منہدم ہو چکی تھی، بہت اذیت دہ تھی۔ ان کی آنکھوں کے خشک سوتے اُبل پڑے ــ بے بسی کے آنسو اُن کے زانوؤں پر گر گر کے اسی طرح معدوم ہو گئے جیسے ان کا وہ پیارا زمانہ اور ان کی اپنی وہ شاد و آباد دنیا ــــ اب اُن کی زندگی کتنی بے مایہ تھی۔

خلقت جلوس دیکھنے میں محو تھی ــــ لوگ بعض اوقات تالیاں پیٹتے یا خوش ہو کر سیٹیاں بجاتے بچّے بہک، بہک کر تجسس میں چیخ چلّا اور ہنس رہے تھے۔ مگر میر نہال اپنے ہی خیالوں میں غرق تھے۔ اس عرصہ میں ان پر کتنے عالم گزر گئے اور دِلّی کیا سے کیا ہو گئی یہ کسی کو خبر نہ تھی۔ لوگوں کے لیے تو دربار ایک خوشی کا بہانہ تھا اور ایک تماشا اور وہ سب تماشائی۔ بچوّں کو محظوظ دیکھ کر میر نہال نے اپنے دل میں کہا: کبھی کے دن بڑے کبھی کی راتیں۔ چاہے انھیں اس وقت خبر نہ ہو مگر ایک دن آئے گا جب بڑے ہوں گے اور ان کو معلوم ہو جائے گا غلامی کیا ہوتی ہے اور آزادی جیسی پیاری شے کھو کر کیسے رنج و محن سے سابقہ پڑتا ہے۔ لیکن یہ راز کیا ہے اور یہ رموزِ حیات کیسے ہیں کہ خوشیاں بھی ان ہی کے حصے میں آتی ہیں جو آنکھیں موند کر اِس جہاں میں جیتے ہیں ــــ بے حسی اور خوشی کا یہ کیسا نباہ ہے؟ کیا بے حسی کا دوسرا نام ہی خوشی ہے؟ یہ ہوش و خرد والے، یہ حساس دلوں کے مالک جن کے دیدہ و دل وا ہیں، ان ہی کے سینے فگار ہو کر ان کے دلوں کے اندر ہی اندر آگ سلگتی رہتی ہے جب میں

روح تپ تپ کر کھبسم ہوجاتی ہے۔ حِس اگر نہ ہوتی تو غموں کے انبار کہاں سے آتے؛ اور میر نہال کو آج جو دکھ درد ستا رہے تھے وہ ان کی نزاکتِ حِس کا نتیجہ تھے۔

جلوس جامع مسجد کے سامنے سے ہوتا ہوا اس کے پیچھے والی سڑک پر مُڑ چکا تھا۔ لوگ باگ زور شور سے خیال آرائیاں کر رہے تھے کہ کون ان میں بادشاہ تھا اور کون بادشاہ نہ تھا۔ کسی تماشائی کی آواز آئی: "وئی مجھے تو وہ سبزے گھوڑے والا باشّا لگ ریا ہے۔ دئی کیسا سینہ تان کے بیٹھا ہے؟ قسم ہے قُلّا اُڈّو کی۔"

اس کے دوست نے کہا: "باولا ہوا ہے، ابے چڑی تن کے غلام۔ تیرے باپ دادا نے بھی کدی باشّا دیکھے ہیں؟ باشّا وردی پہن کے بیٹھے گا؟ تو بھی ٹکڑ گدا ہے دن کا! اندھا۔ اوئے وہ تو اس کی فوج فرا کا کوئی سپاہی ہے۔ خا ما خا باشّا بنا دیا وِسے۔"

ان ہی کا ساتھی بولا: "باشّا ہوتے ہیں زرخ برخ پوشاکوں میں۔ اماں دور سے چھماچم کرتے ہیں۔ نگہ نہیں ٹھہرتی پیارے وِن پر۔" اور پھر افسوس سے کہنے لگا: "دئی ان زرخ برخ والوں کے تو جنازے لد گئے یہ تو ولایتی بندر ہیں۔ وردیاں پہن کے ناچتے ہیں۔ تو نے دیکھے ہی نہیں پیارے اصل بادشا۔"

نسیم کچھ تو بھوکا تھا اور کچھ ماں کی یاد آ کر ہڑ کا کر رہا تھا۔ دوسرے بچے بھی ہاؤں ہاؤں اور روں روں کر رہے تھے۔ کوئی گھر جانا چاہتا تھا کسی کو بھوک لگ رہی تھی اور کسی کو پیشاب آ رہا تھا۔ لوگ اپنے ساتھ حاشتیاں اور بوتلیں اسی واسطے لے کر چلے تھے کیوں کہ وہاں سے نہ اُٹھ سکتے تھے اور نہ کہیں حاجتوں سے فارغ ہونے کی جگہ ہی تھی۔ چنانچہ انھوں نے بچوں کو بوتلوں میں پیشاب کروا دیا۔

لیکن نسیم ابھی تک بسورے جا رہا تھا۔ ماں کے پاس جانے کی ضد چڑھ گئی تھی۔ میر نہال نے اس کو غفور سے لے کر اپنی گود میں بٹھا لیا اور گھٹنے ہلا ہلا کر بہلانے لگے۔

"ہاں بیٹے نہ روؤ دیکھو ابھی چلتے ہیں۔ اہا یہ گھوڑے کیسے ٹھمک ٹھمک جا رہے ہیں"۔ انھوں نے سڑک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گھوڑے سوار دکھائے۔ "اخاہ بھئی یہ گورے ایسے اچھے اچھے کپڑے پہنے جا رہے ہیں۔ کیسے ہنس رہے ہیں، دیکھو بیٹے ہنسو"۔ پھر انھیں کچھ خیال آگیا اور کہنے لگے "یہ ہمیں مٹا چکے اور تمہیں بھی مٹا دیں گے"۔ نسیم بڑی معصومیت سے اپنا انگوٹھا منہ میں لیے ہوئے گھوڑے سواروں کو دیکھتا رہا۔ اس کے دادا خدا جانے کیا بکواس کر رہے تھے۔ یہ بے محل باتیں اور ان کی یہ منطق اس کی سمجھ میں مطلق نہ آئی اور اس نے پھر ٹھنکنا شروع کر دیا اور میر نہال پھر بہلانے لگے: ــــ "ہمارا بیٹا رونا تھوڑی ہے۔ بہت بہادر ہے ان گھوڑے سواروں سے بھی زیادہ بہادر۔ ایک دن ان سب کو مار کر یہاں سے دور بہت دور بھگا دے گا"۔ نسیم نے جلوس سے نگاہیں ہٹا کر منہ اونچا کر کے دادا کو دیکھا۔ اس کی پلکوں پر دو آنسوؤں کے ٹھہرے ہوئے قطرے آفتاب کی شعاعوں میں جھم جھم جھمک رہے تھے۔ دادا نے ہاتھ بڑھا کر اپنے ہاتھ سے اس کے معصوم آنسو پونچھ دیے اور اور پھر نا معلوم وہ کون سی امنگ تھی جس کے تحت وہ پوتے کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے "ہیں نا نسیم تم بڑے ہو کر بہت بہادر بنو گے نا؟"۔ ان کا لہجہ بیحد پُر امید تھا اور ان کی آنکھیں ماضی اور مستقبل کے سہانے خوابوں سے دمک اٹھی تھیں۔

خاص خاص لوگ گزر ہی چکے تھے۔ میر نہال کو اب بیٹھنا دوبھر ہو رہا تھا۔ دوسرے نسیم نے از سر نو غُل مچانا شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے غفور سے کہا: "چلو گھر چلیں"، حالانکہ پورا تماشا ابھی ختم نہ ہوا تھا۔ ان کو جاتا دیکھ کر لوگوں نے پلٹ کر ان کو دیکھا۔ ضرور انھوں نے سوچا ہوگا یہ بھی عجب آدمی ہے۔

جب وہ بڑی سڑک پر آئے تو سڑکیں ابھی تک بند تھیں۔ اور ہر نکڑ ناکے

پر پہرہ تھا۔ شامی اب تک اپنے فرائض اسی طرح انجام دے رہے تھے، اور ٹمین کے
سپاہیوں کی طرح ساکت وجامد کھڑے تھے۔ محض ان کے لال چقندر چہروں پر ہری
ہری آنکھیں کنچوں کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔ میر نہال کو چاوڑی جانے کی اجازت
نہ ملی۔ انھوں نے سوچا چلو چوڑی والوں سے گھر کو ہولیں۔

آج سارا شہر جشن دیکھنے گیا ہوا تھا۔ گلیاں سونی تھیں اور کوچے خاموش،
کہیں کہیں کوئی ایک آدھ بنیے بقال کی دوکان کھلی ملتی تھی۔ جس پر کوئی گاہک
نہ تھا اور دوکان دار اس طرح بیزاری سے بیٹھا ہوا تھا گویا مکھیاں مار رہا ہو۔ اور
کتے بے تکلفی سے نالیوں میں منہ ڈال کر سڑی گلی الم غلم چیزیں نکال رہے تھے۔
قصابوں کی دوکانوں پر کنڈیاں چڑھی ہوئی تھیں اور سامنے ملبے کی ڈھیری پر
دو کتے لال لال زبانیں باہر نکالے مقابلے میں آمنے سامنے ڈٹے ہوئے تھے اور
لمبے لمبے نوکیلے دانت نکال کر بری بری آوازوں میں خوں خاں اور ہوں ہوں کر کے
دھمکیاں دے رہے تھے۔ کبھی کبھی غصّہ میں پچھلی ٹانگوں سے خاک اڑا کر زور زور سے
ہاؤ ہاؤ کرتے تھے۔ لیکن کہیں سے ایک چیل منڈلاتی ہوئی آئی اور جھپٹا مارتی ہوئی
ہڈی کو پنجوں میں دبا کر لے گئی۔ جس ہڈی پر آپس میں جنگ ہو رہی تھی چیل نے آکر
اس کا پاپ ہی کاٹ دیا اور وہ منہ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے اور جھنجھل اتارنے کو دونوں
حریف ایک دوسرے پر پل پڑے اور پھر جہاں ہڈی پڑی ہوئی تھی اس جگہ کو ناک
دے دے کر سونگھنے لگے۔

ہوا کے ساتھ کبھی کبھی گزرتے ہوئے جلوس کا غل شور آجاتا یا کبھی بندوق
کے سر ہونے کی آواز ابھرتی۔ ورنہ شہر میں مکمل سناٹا تھا جیسے پوری دلّی موت کی
نیند سو گئی ہو۔ اور ان خموش گلیوں اور چوراہوں پر گزرتے ہوئے آج میر نہال کو وہی
غدر کا سماں دکھائی دے رہا تھا جب دور سے دندناتی ہوئی گولیوں کی ٹھائیں ٹھائیں
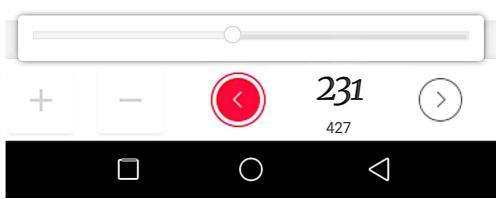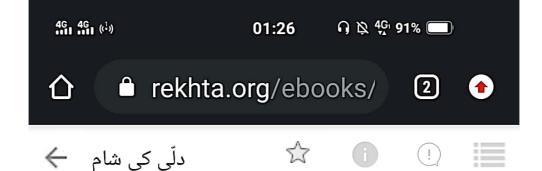
آتی تھی اور لوگوں کے دل دہل جاتے تھے۔ دلّی قبروں کی طرح تاریک اور ہولناک تھی، چاروں جیداروں کی ناشاد لاشیں بے کسی سے پڑی ہوئی تھیں جن کو رونے والے بھی مر چکے تھے۔ دیواریں گری ہوئی، ڈیوڑھیوں کے پھاٹک کچھ جلے ہوئے کچھ ٹوٹے ہوئے، کھڑکیوں کے کواڑ چوپٹ جو ہوا کے ساتھ دھڑ دھڑ کرتے اور یہی معلوم ہوتا کہ ان حسرت زدوں کی نعشوں پر ماتم کر رہے ہیں اور موت ہر کونے میں سے آتی ہوئی دکھائی دیتی، بے کسی اور مردنی ہر چار سمت چھائی ہوئی تھی۔ گدھ اور چیلوں کے لاشیں کھاتے کھاتے پوٹے پھول پھول کر ڈھول ہو گئے تھے۔ یہی خیال ہوتا تھا کہ اجل نے بھی فرنگیوں سے ساز باز کر لی ہے۔

میر نہال سونی گلیوں میں سے گزر رہے تھے۔ ان کی لکڑی گلی کے پتھروں پر لگتی تو کھٹ کھٹ کی آواز ہو جاتی یا پھر ان کے اپنے قدموں کی چاپ کانوں میں گونجتی۔ جب میر نہال اپنے گھر سے کچھ فاصلہ پر رہ گئے تو ان کو ایسا محسوس ہوا کہ ان کے پیچھے کوئی چیز سڑھ سڑھ گھسٹتی ہوئی چلی آ رہی ہے۔ انھوں نے مڑ کر دیکھا تو ایک پتلی گلی میں سے ہاتھوں کے بل اپنی ٹانگوں کو زمین پر معذوری سے گھسیٹتا ہوا ایک اپاہج فقیر چلا آ رہا ہے اور گلے میں بھیک کی ایک چیتھڑا جھولی لٹک رہی ہے جب فقیر ان کے قریب آیا تو میر نہال نے قدم روک لیے اور ہمدردی اور ترس سے اس کو غور سے دیکھا۔ اور انھیں یقین تھا کہ ان کی نگاہ غلطی ہرگز نہیں کر سکتی۔ اس کا چہرہ مہرہ یقیناً چنگیزی تھا۔ بے ڈھنگی ڈاڑھی اور بانکے دہاڑوں کے باوجود اس کی صورت رعب دار تھی۔ ذلت اور خواری میں بھی خاندانی وقار ٹپک رہا تھا گو آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ ستایا ہوا ہے۔ اس عبرت کے مرقع کو دیکھ کر میر نہال کا اپنا چہرہ حسرت انگیز ہو گیا۔ انھوں نے جلدی سے ایک روپیہ جیب سے نکال کر بڑی تمیز سے فقیر کی جھولی میں ڈال دیا، اور پھر پوچھنے لگے: "کیوں صاحبزادے

صاحب کیا آپ بھی فرنگی بادشاہ کا جشن دیکھنے تشریف لے جائیے گا؟"
فقیر کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا۔ ضبط کرنے سے گالوں کی رگیں تن گئیں اور وہ ٹھنڈی آہ بھر کر کہنے لگا:

"نہیں بھائی نہ وقت ہمارا ہے نہ اس کے اہتمام۔ ہاں ایک زمانہ تھا کہ ہمارا بھی وقت تھا۔ کبھی ہمارے بھی جشن منائے جاتے تھے۔ ایک جہاں ہماری جھلک دیکھنے کو سرِ راہ منتظر ہوتا تھا۔ لیکن صاحب وہ آئینہ ہی ٹوٹ کر چکنا چور ہوگیا۔ نہ اپنی ہی صورت دیکھ سکتے ہیں اور نہ دوسروں کو دکھا سکتے ہیں۔ کبھی دلاوروں کے سر ہمارے قدموں میں جھکتے تھے۔ ہم پالن ہار تھے کوئی ہمارے در سے بے نیل و مرام نہ لوٹتا تھا۔ مگر آج ہم خاکِ پا سے بھی زیادہ ذلیل و خوار ہوکر گلی در گلی کوچہ بہ کوچہ دربدر ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں، وہ بزم کیا اُجڑی کہ راہ گزار بھی جگہ نہیں دیتی اور گردشِ ایام اُڑائے لیے پھرتی ہے" ـــــ وہ تھوڑی دیر خاموش ہوگیا اور ٹھہر کر بولا:

"یہ کہتے ہوئے جی چاہتا ہے کہ زبان پر فالج گر جائے کہ چنگیز ہمارا مورثِ اعلیٰ ہے، وہ چنگیز اور ہلاکو جن کے نام سے بھی لوگ تھرّا جاتے تھے اور ہم اسی تیمور کی اولاد ہیں جو تاجوروں کا سلطان تھا اس شاہجہاں کا خون ہماری رگ میں دوڑ رہا ہے جس نے ایک مقبرے پر لاکھوں جبرہ شاہی لٹا دیے تھے۔ اب ہم دو دو دانے کو محتاج ہیں۔ ہماری غربت دیکھ کر حضرت عزرائیل کو بھی ہمارے پاس آتے ہوئے عار آتی ہے۔"

آج جو نیرنگیٔ دوراں کے ہاتھوں فقیر تھا اس کو دنیا کبھی میرزا نصیر الملک کہہ کر خطاب کرتی تھی۔ وہ بہادر شاہ کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے اور یہ کہتے ہوئے ان کی آواز فورِ رنج و مایوسی سے ڈوبتی جا رہی تھی۔ انھوں نے گردن جھکالی۔ آنسوؤں

کے انمول موتی ان کی بھیک کی جھولی پر گرنے لگے۔ میر نہال غم سے چور چور ہو رہے تھے کہ شہزادے نے اجازت چاہی "اب میں چلتا ہوں" اور وہ اسی طرح گھسٹ گھسٹ کر گلیوں میں غائب ہو گئے۔

میر نہال تھوڑی دیر وہیں کھڑے رہے۔ انھیں اس عرصہ میں ایسا معلوم ہوا گویا آلِ تیمور کا آخری چراغ، وہ ضعیف العمر شہنشاہ، آج بھی ان کے سامنے مظلوم و مغموم کھڑا ہے۔ پھر خالی ہاتھ اور محزوں دل وہ گھر لوٹ آئے جیسے کوئی تمام اثاثہ اثنائے سفر میں قزاقوں سے لٹوا آئے۔ پرانے اور تلخ واقعات نے انھیں بھی ایک عمارت کی طرح کھوکھلا کر دیا تھا۔ ان کے چہرے پر حقارت آمیز تبسم تھا جیسے گل نے وہ رمازِ بے ثباتی پا لیا ہو جو بربادی و تباہی گلشن کا سبب تھا۔ اس وقت کائنات ان کے سامنے ہیچ تھی اور انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ دنیا باطل ہے اور زمانہ بے قرار۔ یہ قومیں غیر متنزلزل ہیں۔ کون ان سے برسرِ پیکار ہو سکتا ہے؟ شہنشاہ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ خاندان بن کر بگڑ جاتے ہیں۔ لحظہ بہ لحظہ یہ تصویر بدلتی رہتی ہے رات کے بعد دن آتا ہے اور دن کے بعد پھر رات۔ پل پل کر کے جگ بیت جاتے ہیں۔ ہمیشہ سے کارگہہ جہاں کا یہی دستور ہے اور فنا و بقا کی یہی چشمک، اور لبِ حیات مسکراہٹوں سے محروم رہتے ہیں مگر زندگی یونہی سسک سسک کر کسی نو بہ نو جستجو میں آگے بڑھتی رہتی ہے۔ یوں ہی زمانہ دنیا کو بنا بنا کر مٹاتا ہے اور مٹا مٹا کر بناتا ہے بناتا رہے گا۔ گویا یہ مٹی اور ریچوں کا کھیل ہے۔ زمین کبھی ہموار نظر آتی ہے اور کبھی نشیب و فراز دکھائی دیتے ہیں فنا و زیست میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔